دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۳ | ماہ ربیع الآخر ۱۴۳۵ھ مطابق ماہ فروری ۲۰۱۴ء | عدد ۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

ملک میں عام پارلیمانی انتخابات کی آمد آمد ہے۔ باضابطہ تاریخوں کا اگرچہ ابھی اعلان نہیں ہوا ہے لیکن سیاست کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا جاتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ جو جہاں ہے گوش برآواز ہے۔ انتخابات کا یہ جمہوری عمل دیکھا جائے تو ملک اور باشندگان ملک کی ذہنی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے تسلسل کا ایسا آئینہ و پیمانہ ہے جس میں ملک خود اپنی اصل شکل کے بنتے سنورتے خدوخال کے مشاہدہ اور پھر احتساب کی توفیق پاتا ہے۔ ملک کو آزاد ہوئے، ساٹھ پینسٹھ سال کا عرصہ ہوا، انتخابات کے موسم آتے جاتے رہے لیکن محسوس یہی ہوتا ہے کہ ایک سیکولر اور جمہوری دستور کے سایہ میں اصل مسائل اور ان کے عوامل اور پھر ان کے حل کے احتساب کے لیے فکر و نظر کی جو وسعت مطلوب ہے اس کا حق نہیں ادا کیا گیا، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ الکشن کو متاع کوچہ و بازار کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کو اس طرح پیش کیے جانے کا چلن شروع ہوا گویا یہ بازار کی شئے (پروڈکٹ) ہیں، جن کی مقبولیت میں دلکش و جاذب نظر لیبلوں کا اثر ان کی اصل خوبی یا خرابی پر غالب ہے۔ بازاریت کی زلف گرہ گیر میں سیاست کی یہ اسیری عبرت انگیز ہے، مہلک اور جان لیوا لیکن مقبول عام اشیاء کے متعلق کسی گوشہ میں یہ انتباہ تو رہتا ہے کہ 'یہ آپ کی صحت کے لیے مضرت رساں ہے، تو' کیا ذرائع ابلاغ میں سیاسی اشتہاروں کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟ جواب جو بھی ہو، لیکن قانون و حکومت کو بازار و اشتہار سے دور دیکھنے والوں کے لیے یہ لمحہ فکر یہ ضرور ہے۔

اب تک کے شور و غل سے بظاہر محاذ آرائی کانگریس اور بی جے پی کی ہے، محدود حلقہ اثر کی دوسری جماعتیں بھی ہیں جو انتخاب کے وقت تک تو تیسرے، چوتھے محاذوں کی باتیں کرتی ہیں لیکن نتائج کے ظہور کے بعد ان کا وجود کسی نہ کسی شکل میں کانگریس اور بی جے پی کے خیموں ہی میں نظر آتا ہے، اقتدار کی خواہش کے تحت نظریاتی اختلاف کے وقتی اتحاد میں بدل جانے کا منظر ادھر برسوں سے ملک کی نگاہوں میں پھرتا رہا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اکثریتی طبقہ پر اس تبدل یا تداخل کا کوئی گہرا اثر بھی مرتب نہیں ہوتا، یقیناً بدعنوانی، گرانی اور بے روزگاری جیسے مسائل اکثریت و اقلیت دونوں کے لیے سب سے اہم ہیں لیکن عیار و مفاد پرست سیاست کے لیے ان کو فرقہ وارانہ جذبات کی تندی و گرمی

کے حوالے کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں۔اسی حربہ کو اس الیکشن میں بھی آزمانے کی تیاریاں ہیں، جہاں تک مذہبی، قانونی اور تمام شہری مفادات کا تعلق ہے، اکثریتی طبقات میں کسی نہ کسی درجہ میں ان کی پاسداری کرنے والی طاقتیں ہیں۔ایسے میں اصل مسئلہ اقلیت یا دوسرے الفاظ میں مسلمانوں کا ہے، جن کے ووٹوں کی اہمیت کا اعتراف تو کیا جاتا ہے لیکن جن کے حقوق و مطالبات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز بھی کیا جاتا رہا ہے اور اس غیر منصفانہ طرز عمل میں اب تک کوئی جماعت بھی ایک دوسرے سے جدا نظر نہیں آئی۔

ملک میں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی تنظیموں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق سو کے قریب ہے، لیکن چند نہایت محدود علاقوں کے سوا کہیں ان تنظیموں کی وہ سیاسی فہم و فراست، دور اندیشی اور عاقبت بینی نظر نہیں آتی جن کی ان سے توقع کی جاتی ہے۔صرف الیکشن کے وقت ان کا طلوع اور اس کے بعد ان کا طویل غروب، گردش لیل و نہار کے فطری و قدرتی عمل سے جس قدر دور ہے، اس کا مطالعہ اگرچہ نہایت تکلیف دہ ہے لیکن اس کا تجزیہ بہر حال ضروری ہے۔ستاروں کو نشان راہ دکھانے والے خود کسی مرد راہ داں کی تلاش میں سرگرداں ہیں، ایسا کیوں ہے؟ سیاست کیا ہے؟ اس کے ملکی اور ملی حدود کیا ہیں؟ کمی کس بات کی ہے اور علاج کے لیے نسخہ کیمیا کیا ہے؟ ان سوالوں سے صرف نظر کیوں کیا گیا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ان سوالوں نے گذشتہ صدی سے اہل فکر و نظر اور ارباب بصیرت کو بے قرار اور محو جستجو ضرور رکھا۔معارف نے ابتدا ہی سے ہندی مسلمانوں کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ زندگی کے میدان کے حقائق پر نظر ضروری ہے، کل کا مقابلہ تیغ و خنجر سے تھا آج مقابلہ کا میدان دوسرا ہے جس کے لیے غصہ و غضب اور جوش و خروش کی جگہ غور و فکر، مسلسل جد و جہد، ہشیاری و بیداری اور عمل کی ضرورت ہے۔قوم بنتی ہے تو صبر و استقلال، وقار، متانت اور قومی خصائل کی حفاظت جیسے اوصاف سے۔معارف نے مسلسل کہا کہ مسلمانوں کے لیے حالات اگر قلق افزا ہیں تو وجہ یہی ہے کہ رہنما مختلف الرائے اور عوام غافل و بے پروا ہیں، جوش آتا ہے تو کچھ دور دوڑتے ہیں اور پھر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔جماعتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر ان جماعتوں سے خدا جانے کتنی اور جماعتیں انتشار کا مظہر بن کر مسلمانوں کی حالت زار کا سبب بن جاتی ہیں۔بار بار یہ سچائی ظاہر کی جاتی رہی کہ عقیدہ، خیال اور مقصد کی وحدت سے جامعیت، یکجائی اور اتحاد ہے، یہ وہ شیرازہ ہے جو منتشر افراد کو اس طرح ایک کر دیتا ہے کہ پھر یہی افراد قوم بن کر ناقابل تسخیر ہو جاتے ہیں، پھر ذاتی غرض، مالی حرص و طمع، نفسانی اور خاندانی عزت و جاہ کی ہر

خواہش، مقصد کی وحدت کی آگ میں بھسم ہوجاتی ہے، مسلمانوں کے عروج وزوال اوران کی ترقی و تنزل کی داستانوں میں بس یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔کیسی عجیب بات ہے کہ ٹھیک سوسال پہلے علامہ شبلی بتا رہے تھے کہ پالیٹکس دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے جوانسان میں ہرقسم کا ایثار پیدا کرتا ہے، رہنما تو وہ ہے جوخطاب، جائداد، دولت سے آزاد ہو، پرجوش اور دلیر ہو۔آج بھی یہ الفاظ کم ازکم ہماری قوم میں اپنی معنویت کے اظہار کے منتظر ہیں، اگر ایسے رہنمانہیں تو کیا رہنما بنانے والوں کا بھی کچھ قصور ہے؟ کاش اس سوال کا جواب مل جائے۔

اوپر علامہ شبلی کا ذکر آ گیا،سوسال پہلے وہ اسی ۱۴ ۲۰ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔سو سال میں کیسے کیسے انقلابات آئے،لیکن علامہ شبلی کے افکار ونظریات پرخزاں کا موسم نہیں آیا، بلکہ ان کی دلآویزی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔اب شبلی کو پڑھنے اور سمجھنے کی لہریں،موجوں میں بدل رہی ہیں۔گذشتہ دنوں اورنگ آباد کے مشہور تعلیمی ادارہ کاشف العلوم میں رابطہ ادب اسلامی کے سالانہ سمینار نے شبلی کی قومی وملی شاعری اوراس کے اثرات کو اپنا موضوع بنایا۔خوشی کی بات ہے کہ مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا واضح رشید ندوی،مولانا ریاض الدین فاروقی، پروفیسر محسن عثمانی، انیس چشتی، مضطر مجاز، شعیب کوٹی، مصطفیٰ رفاعی جیسے ناموراور پختہ مشق اصحاب قلم کے جلو میں نئے لکھنے والے خاصی تعداد میں تھے۔ شبلی کی شاعری پران نئے لکھنے والوں میں جنوبی ہند کے نوجوانوں کے مقالے کسی طرح دوسروں سے کم نہیں تھے۔شبلی کی نظموں کے بارے میں ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ درحقیقت زمان ومکاں کی قید سے آزاد ہیں۔سچائی یہی ہے کہ شبلی اسلام کے رجز وحدی خواں تھے اوراسی سے بقائے دوام کا رتبہ حاصل ہوتا ہے۔

۲۰۱۴ء کو شبلی اور دارالمصنّفین تقریبات صدی بنانے اور منانے کے لیے ناظم دارالمصنّفین ہمہ تن کوشاں ہیں، اس مناسبت سے طے کیا گیا کہ علامہ شبلی کی کتابوں کے مکمل سیٹ کی خریداری پر مکاتیب شبلی کی دونوں جلدیں بطور تحفہ پیش کی جائیں گی۔

دارالمصنّفین میں سیرت سمینار کی تاریخ ہولی کے تہوار کے پیش نظر اب ۲۴/۲۳/ مارچ کردی گئی ہے۔

مقالات

دعوتِ نبویؐ پر قریشی اکابر کا ردعمل
سماجی تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

مشہور عام مصادر سیرت کا بہت مقبول بیان ہے کہ ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد دعوت کا کام شروع کیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ ہوا، مردوں میں نوجوانوں نے اور لوگوں میں کمزوروں نے اسے قبول کیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی تعداد کافی ہوگئی (حتی کثر من آمن به) ۔کفار قریش کے سردار (وجوہ) آپؐ کی دعوت پر کوئی نکیر نہ کرتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مجالس کے پاس سے گذرتے تو آپؐ کی طرف اشارے کرتے اور کہتے ''بنوعبدالمطلب کا جوان (غلام) آسمان کی باتیں کرتا ہے۔ان کا یہی حال رہا یہاں تک کہ آپؐ نے ان کے خداؤں پر نکتہ چینی کی اور ان کے آباء واجداد کو کفر و گمراہی پر مرنے کے سبب جہنم میں بتایا تو انہوں نے اسے ناپسند کیا، آپؐ سے نفرت وعداوت کی اور ایذا دینا شروع کی''۔امام زہریؒ کی اس روایت کو واقدیؒ نے اپنی سند سے بیان کیا ہے۔اس کو امام واقدیؒ کے شاگرد و کاتب امام ابن سعدؒ نے اور امام بلاذریؒ نے کچھ اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔امام سیرت ابن اسحاقؒ کی بلاسند روایت ابن ہشامؒ بھی اسی طرح ہے۔ان تمام مآخذ اور ان کے قدیم راویوں اور مولفوں نے شیوخ قریش اور سادات مکہ کی عداوت و مخالفت کا زمانہ رسالت کے تین سالہ دور خفیہ تبلیغ کے بعد علانیہ دعوت وارشاد کا اولین عہد متعین کیا ہے۔تاریخی توقیت کے اعتبار سے وہ ۳ر نبوی /۶۱۳ء کا سال ہے۔متعدد جدید سیرت نگاروں اور محققوں نے

ادارہ علوم اسلامیہ/شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

بھی اس بیان کو بعض تحفظات کے ساتھ قبول کرلیا ہے۔(۱)

قدیم ترین مولفین سیرت نے مکی اکابر کی مخالفت اسلام، عناد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور عداوت دین کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے: ۱-مستہزئین جو صرف زبانی کلامی تمسخر کرتے اور مذاق اڑاتے تھے، ان کا استہزاء ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ ہوتا۔۲-مخالفین اور معمولی ایذا دینے والے جو مار پیٹ بھی کرتے اور طرح طرح سے جسمانی زدوکوب کرتے اور زبانی طنز وتعریض بھی کرتے۔۳-موذیین جو سخت ایذا دیتے اور جسمانی تکلیف وایذا میں کسی قسم کی کسر نہ اٹھا رکھتے اگرچہ وہ بھی جان لینے سے احتراز کرتے تھے۔

جدید سیرت نگاروں نے بالعموم اس سہ گانہ تقسیم اکابر مکہ کو اپنے اپنے انداز سے قبول کیا ہے۔مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ ''سارے قبیلۂ قریش کا رویہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں یکساں نہ تھا بلکہ لوگ مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ایک طبقہ شدید ترین مخالفین کا تھا جو زیادہ تر بڑے بڑے سرداروں پر مشتمل تھا......دوسرا طبقہ ان بہت سے سرداران قریش کا تھا جو دشمن تو ضرور تھے مگر ایسے دشمن نہ تھے کہ مقدم الذکر گروہ کی طرح ہاتھ دھوکر نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے ہوں البتہ اسلام کے خلاف جو کارروائیاں کی جاتی تھیں، ان میں وہ دشمنوں کا ساتھ دیتے تھے.....'' مولانا موصوف نے ابن سعد کے حوالے سے ان دونوں طبقات کے بڑے ناموں کا ذکر بھی کیا ہے اور آخر میں عام اہل مکہ میں کچھ کو غیر جانبدار، کچھ کو اسلام کا قائل اور دل سے مومن اور ایک بڑی تعداد کو اپنے سرداروں کے بھڑکانے سے دین آبائی کی حمیت میں مبتلا ہوکر شرارتوں کا مرتکب بتایا ہے۔ان کا یہ تجزیہ دوسروں کے ہاں بھی ملتا ہے۔(۲)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے معمر افراد اور اکابر قریش کی دشمنی کا سبب ان کے نوجوان عزیزوں کا قبول اسلام قرار دیا ہے کہ وہ اسے اپنی توہین سمجھتے تھے۔(۳)

اردو سیرت نگاری کے امام اول شبلیؒ نے قریش کی مخالفت کے پانچ اسباب سے ایک تجزیاتی بحث کی ہے۔وہ اسباب خمسہ تھے: ''آبائی رسم وعقائد کے خلاف دعوت اسلامی نے ان کو سخت برہم کردیا اور مخالفت نے انتقام پر اکسایا، ۲-قریش کی عظمت وعالم گیر اثر کے خاتمہ کے خدشے نے ان کو مخالفت پر آمادہ کیا اور جن کو زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا وہ اتنے ہی سرگرم تھے ان

میں بعض اہم سرداران قریش کا ذکر کیا ہے، ۳-قریش کو اسلام و عیسائیت کی بہت سی مشترک باتوں سے خیال ہوا کہ آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں، ۴-ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی اور بنو ہاشم کی مخالفت بنو امیہ کرتے تھے، ۵-قریشی بداخلاقیوں پر خاص کر ان کے شیوخ و اکابر کی کرتوتوں پر قرآن مجید اور نبوی نکتہ چینی نے ان کو سخت مخالف بنا دیا۔ انہوں نے قریش کے تحمل کے اسباب سے بحث کر کے آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ''روسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بدنفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے۔ اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے''۔ (۴)

اس مختصر مقالے میں قریشی اکابر کے اسلامی دعوت پر ردعمل کا ایک تاریخی اور سماجی تجزیہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بظاہر اکابر قریش اور ان کے زیر اثر عوام کا سماجی اور دینی رویہ اس طبقاتی تقسیم کی تائید کرتا ہے مگر وہ درحقیقت ایسا ہے نہیں۔ انسانی سماجی اور دینی رویے مختلف جبلتوں، فطرتوں کے علاوہ خارجی اسباب وعناصر سے بھی طے ہوتے ہیں اور وہ ان کو پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔

مخالفت کا آغاز: نبوی دعوت اور اس کی فوری کامیابی نے قریشی اکابر کے ردعمل کی بنیاد ڈالی تھی جو قطعی فطری بھی تھی۔ قریش کے عوام و خواص کو بالعموم اور ان کے شیوخ و اکابر کو خاص کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان رسالت پر سب سے پہلے تحیر و تحقیر کا سخت ردعمل ہوا تھا۔ وہ رسالت و دعوت کے کار عظیم کے لیے دونوں شہروں کے کسی مرد عظیم کو حقدار سمجھتے تھے۔ ان میں مکہ و قریش کے بڑے بڑے اکابر و شیوخ اور طائف و ثقیف کے نامور و طاقتور سادات و مشائخ اور ان کے سرخیل شامل تھے۔ قرآن و حدیث نے ان کی طرف اشارہ کنایہ اور تلمیحات سے اشارہ کیا ہے اور کتب سیرت و تفسیر نے ان کی تفصیل پیش کی ہے۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف عالیہ کے معترف تھے اور بلند کردار و عظیم و پاک شخصیت کے قائل بھی لیکن رسالت کے منصب کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ ان کے ذہن و فکر میں سیاسی و سماجی اقتدار اور دینی و معاشرتی سیادت منصب رسالت پر فائز ہونے کی شرط اولین تھی (۵)۔ اس لیے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ''غلام بنو عبدالمطلب'' بتا کر سماجی شرف اور سیاسی سیادت سے محروم شخص بتاتے تھے اور اسی بنا پر

وہ تحقیر و تنقیص کا رویہ اپناتے تھے اور اپنی حیرت، پریشانی اور فکر مندی کا اس کے ذریعہ اظہار کرتے تھے۔ زبانی طنز و تعریض اور طعن و تشنیع کا سلسلہ ان کے اسی فکری و ذہنی مزاج اور سماجی و دینی رویے کے سبب چلا تھا(۶)۔ اس کا آغاز قرآن مجید کی تنزیل کے بعد سے ہوا تھا اور رسالت و دعوت کے کام نے مخالفت کو آگ دی تھی، نظم قرآن کے لحاظ سے وہ اولین دور کا واقعہ ہے۔

کار دعوت کے مسلسل ارتقاء کے ساتھ ساتھ اکابر قریش کے ردعمل، زبانی طنز و تعریض اور جسمانی تعذیب کا سلسلہ خود بخود جڑ گیا۔ مختلف اسباب سے جن میں خاص رواجی دین قریش سے اختلاف اہم ترین اور دینی سبب تھا بعض اکابر قریش نے مار پیٹ اور جسمانی ایذا کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور اس کا آغاز خفیہ تبلیغ کے اولین زمانے سے ہو گیا تھا۔ ابتدائی مکی دور کی تمام مکی سورتوں اور ان کی خاص آیات کریمہ میں قریش کے غلط عقائد و اعمال پر نقد قرآنی اصل سبب تھا اور نیا دین تو خار نظر تھا ہی۔ بلاذری وغیرہ کی روایات سے خفیہ دعوت اسلامی کی مختلف منزلوں کی تاریخی توقیت کی جا سکتی ہے اور قریشی ردعمل کی سلسلہ وار تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ عام اور مشہور مصادر سیرت کی روایات اور مستند احادیث سے بھی ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

اولین مکی مسلمانوں میں حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل عدویؓ نے اپنا تجربہ بیان کیا ہے کہ ایک سال تک ہم نے اسلام کو مخفی رکھا، ہم صرف بند گھروں میں یا خالی گھاٹیوں میں ہی نماز پڑھتے تھے اور وہ بھی اس حال میں کہ بعض لوگ نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اولین زمانہ خفیہ میں وادیوں یا دوسری کھلی جگہوں پر نماز پڑھنے کے اوقات میں صحابہ کرامؓ کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی اسی طرح بعض حضرات نگرانی کرتے تھے۔ جیسے بلاذری کے مطابق حضرات زید بن حارثہ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما تمام دنوں کی نمازوں کے دوران کرتے تھے(۷)۔ قریشی نگرانی دراصل ناکہ بندی کی کوشش تھی۔

۲- سابقین اولین کے ایک حوصلہ مند و جرأت آزما صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص مالک زہریؓ کا بیان ہے کہ میں سعید بن زید، خباب بن ارت تمیمی، عمار بن یاسر مذحجی اور عبداللہ بن مسعود ہذلی رضی اللہ عنہم کے ساتھ شعب ابی ربید میں گیا، ہم وہاں وضو کر کے نماز اسی خفیہ زمانے میں پڑھ رہے تھے کہ مشرکوں کا ایک گروہ وہاں پہنچا اور وہ یوں ہی نہیں پہنچا تھا وہ ہماری

گھات میں رہتے تھے اور ہمارے آثار قدم کا پتہ لگاتے تھے۔ ان میں ابوسفیان بن حرب اموی، اخنس بن شریق ثقفی اوران کے علاوہ بعض دوسرے شامل تھے۔ انہوں نے نہ صرف ہم پر نکتہ چینی کی اور ہمارے فعل کو ناپسندیدہ بتایا بلکہ ہمارے گریبان پکڑ لیے۔ میں نے اونٹ کی ایک ہڈی اٹھا کر ایک مشرک کے سر پر دے ماری جس سے اس کی کھال پھٹ گئی اور خون بہہ نکلا۔ جس سے مشرکین گھبرا گئے اور میرے اصحاب چھا گئے اور ہم نے ان کو گھاٹی سے نکال باہر کیا۔(۸)

۳- ایک مسلم خاتون حضرت عزیزہ بنت ابی تجرأۃ کا بیان ہے کہ قریش نماز ضحیٰ پر کسی قسم کی نکیر نہ کرتے تھے کہ وہ خود اسے پڑھتے تھے لیکن نماز عصر کے وقت صحابہؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گھاٹیوں میں بکھر جاتے اور ایک دو کر کے نماز پڑھا کرتے، اسی زمانہ خفیہ میں حضرت طلیب بن عمیر عبدی قرشی اور حضرت حاطب بن عمرو عامری رضی اللہ عنہما اجیاد اصغر نامی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ان پر ابن الاصداء اور ابن الغیطلہ (مقیس بن قیس سہمی) نے حملہ کیا کیونکہ وہ دونوں سخت دشمن تھے (فاحشین) مسلمانوں نے ان کو مار مار کر بھگایا(۹)۔ ان دونوں کو سخت مزاج وسنگدل قرار دینے سے نتیجہ نکلتا ہے کہ کچھ دوسرے ایسے تندخو نہ تھے اور یہ واقعہ ہے۔

۴- بطور تاریخی پس منظر ایک روایت میں بلاذری نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ قریش مکہ کے اکابر نے حضرت سعیدؓ کے پدر گرامی حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدویؓ کو قریش کے مشرکانہ رسوم سے اختلاف کرنے اور حنفی طریقہ پر عبادت کرنے پر مکہ مکرمہ سے نکال باہر کیا تھا اور ان کے سخت دشمن بن گئے تھے۔ ان پر زبانی طنز وتعریض کرنے کے علاوہ ان کو ایذا دیتے تھے۔(۱۰)

۵- نبوی دعوت کے اولین تین سالہ مخفی دور کے محض یہ چند واقعات وروایات ہیں۔ تحقیق وجستجو سے اور بھی ایسے ملیں گے، ان سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ونبوت اور ادائے رسالت ودعوت کوئی ایسا خفیہ معاملہ نہ تھا، وہ جدید زبان میں ایک کھلا ہوا راز تھا جسے سب جانتے تھے اور اکابر قریش اس سے زیادہ سمجھتے تھے اور متلاشیان قوم اس کی تاک میں رہتے تھے اور اہل ایمان کے اعمال واشغال کا پتہ لگائے رہتے تھے اور جب موقع مل جاتا ہاتھ بھی دکھا جاتے تھے۔(۱۱)

اعتدال وتحمل، موافقت وموانست اور صلح کل کا رویہ بھی اسی زمانہ خفیہ میں تاریخ کے

اوراق میں ثبت ہے۔ بعض اکابر قریش نے اپنے عزیزوں کو اسلام کے عقائد و ارکان خاص کر نماز کی ادائیگی دیکھی تو سوال و جواب تو ضرور کیے مگر نکیر و تعریض نہ کی بلکہ بعض موافق و محبّ اکابر نے تو ان کی اجازت عزیزوں کو دے دی، اگر چہ خود ان سے اتفاق نہ کیا۔ مشہور روایت ہے کہ ابوطالب بن عبدالمطلب ہاشمی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے خورد سال فرزند حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ وہ کون سا دین ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر کہ وہ آپ کے اور ہمارے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے، وہ چپ رہے اور خود اسے قبول کرنے سے معذرت کی مگر اپنے فرزند کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی کھلی اجازت دے دی۔ یہ ابن اسحاق/ابن ہشام کی روایت کا خلاصہ ہے اور اس میں جناب ابوطالب کے اتفاقاً آجانے کا ذکر ہے مگر بلاذری نے اس کا تعاقب نام دیا ہے (۱۲)۔ اسی روایتِ بلاذری میں حضرت علیؓ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہؓ بنت اسد کی ''مولاۃ'' کا پتہ لگانے اور خبر دینے کا ذکر ہے اور ابوطالب کی خاموش حمایت کا بھی۔

علانیہ دعوت اسلامی کی اولین مجلس بنی عبدمناف میں اسی طرح کے دورویے دو اکابر کی طرف سے نظر آئے۔ ابولہب بن عبدالمطلب ہاشمی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ آپؐ کے ہاتھ باندھ دینے کی تجویز رکھی۔ ابوطالب ہاشمی نے پیغام حق کی حمایت تو نہ کی لیکن دوسرے اکابر بنی عبدمناف کے ساتھ دوسری مجلس میں اسے بہ تحمل سنا اور اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محافظت اور حمایت خاندانی کا پختہ اعلان بھی کر دیا۔ بالکل ایسے ہی دو متضاد سماجی اور دینی رویے کوہِ صفا کے مشہور خطبۂ نبوی کے بعد منظر عام پر آئے: ایک مخالف تھا تو دوسرا حامی۔ عام روایت پرست سیرت نگار بلکہ ایک خاص ماخذ کے پیروکار صرف مخالفانہ رویہ کا ذکر کرتے ہیں اور دوسرے معتدل رویہ کا حوالہ نہیں دیتے جبکہ مآخذ سیرت ان دونوں سماجی رویوں کا واضح ذکر کرتے ہیں۔ بلاذری نے علانیہ دعوت اسلام قریبی عزیزوں کو دینے کے سلسلہ میں زیادہ تفصیل دی ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھیوں کے اہم اور معنی خیز مشورہ کا ذکر کیا ہے کہ بنوعبدالمطلب/بنوعبدمناف کو بلاؤ مگر ان میں عبدالعزیٰ کو دعوت نہ دو کہ وہ قبول کرنے والا نہیں۔ بلا دعوت ابولہب بھی اس مجلس

دعوت میں آیا اور اس نے جو تقریر کی وہ قومی خدشات پر مبنی تھی کہ تمہارا خاندان بطونِ قریش کی مخالفت کا سامنا نہ کر سکے گا، لہٰذا ایسا کام نہ کرو۔ اس بار آپؐ خاموش رہے، دوسری مجلس میں بہرحال آپؐ نے اپنی بات کہی۔ ابو طالب نے اپنی کلی حمایت کا اعلان کیا اگرچہ ترک دین کا انکار کیا اور ابولہب نے سخت مخالفت کی۔ دوسرے اکابر خاندان کے خاموش رہنے کا ہی ذکر ملتا ہے یا دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ روایات میں ان کے ردعمل کی وضاحت نہیں کی گئی۔ (۱۳)

کوہ صفا سے علانیہ دعوت قریش کے باب میں دو قسم کی روایات ملتی ہیں۔ عام طور سے روایتی سیرت نگار صرف ایک کا ذکر کرتے ہیں۔ اول روایت یہ ہے کہ آپؐ نے صفا پر چڑھ کر قریش کو پکارا اور باری باری بطون قریش کا نام لیا تو باقی واپس چلے گئے اور صرف بنوعبدمناف آخر میں رہ گئے۔ آپؐ نے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی اور اس پر ابولہب نے آپؐ کی مخالفت کی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ آپؐ نے ''معشرِ قریش'' کی صدا لگائی تو سب جمع ہو گئے اور آپؐ نے مشہور خطبہ دیا جس کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں بنوعبدالمطلب، بنوعبدمناف، بنوزہرہ کا ذکر صریح ہے اور پھر تمام قریش کے بطون اور خاندان (افخاذ) کا کلی حوالہ ہے۔ بلاذری نے ایسی تین روایات اور تینوں حضرت ابن عباسؓ کی سند سے بیان کی ہیں۔ ان تینوں میں خطبات نبویؐ کا فرق ملتا ہے۔ لیکن قریشی ردعمل میں صرف ابولہب ہاشمی کا ردعمل بیان کیا ہے اور اس کے بیان و ردعمل پر سورہ ابی لہب کے نزول کا بھی ذکر ہے۔ امام بخاریؒ نے اس سورہ کریمہ کی شان نزول و تفسیر میں تین احادیث: ۴۹۷۱، ۴۹۷۲، ۴۹۷۳۔ تین ابواب میں نقل کی ہیں۔ وہ تینوں بھی حضرت ابن عباسؓ سے تین مختلف اسناد کے ساتھ مذکور ہیں اگرچہ صحابی موصوف سے صرف حضرت سعید بن جبیر نے روایت کی ہے۔ ان میں سے اول الذکر دو احادیث میں متن یکساں ہونے کے باوجود فرق ہے۔ اول میں کوہ صفا کا واضح ذکر ہے اور دوم میں بطحاء کے پہاڑ کا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عرب کے دستور انذار ''یا صباحاہ'' کے بعد لوگوں نے اور دوم کے مطابق قریش نے جمع ہو کر آپؐ کا خطاب سنا۔ خطاب نبوی میں صرف یہ اظہار ہے کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے عقب (سفح) سے ایک دشمن تم پر صبح یا شام حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں، کیونکہ ہم نے تمہارے بارے میں جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔ تب آپؐ نے فرمایا کہ

میں ایک عذاب شدید سے پہلے تمہارے لیے ''نذیر مبین'' بن کر آیا ہوں۔ ابولہب نے کہا کہ تمہارا ناس ہو کیا تم نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا (۱۴)۔ یہی شان نزول ہے۔ سورہ شعراء کی تفسیر آیت مذکورہ بالا میں امام بخاریؒ نے دو احادیث: ۴۷۷۰، ۴۷۷۱ بالترتیب حضرات ابن عباس و ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہیں، اس کو اصل متن کی حیثیت حاصل ہے اور اس میں اول میں کوہ صفا سے بنوفہر، بنوعدی، بطون قریش کے پکارنے اور ان کے جمع ہونے کا ذکر ہے۔ خاص کر ابولہب اور قریش کے اجتماع کا اور اس میں خطبہ کا متن قریب قریب یکساں ہے البتہ یہ اضافہ اہم ہے کہ جو شخص نہ آسکا اس نے اپنا نمائندہ بھیج دیا۔ دوسری حدیث میں بنوعبد مناف سے خاص خطاب ہے جس میں کوہ صفا یا مقام کا ذکر نہیں۔ آپؐ نے اس میں بنوعبدالمطلب کو پھر عباسؓ بن عبدالمطلب اور آخر میں اپنی پھوپھی صفیہؓ اور دختر حضرت فاطمہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ میں اللہ سے تمہیں بچا نہیں سکتا۔ البتہ تم مجھ سے مال مانگ سکتے ہو۔ (۱۵)

فتح الباری کے مباحث سے سب سے اہم حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ دعوت عام کا واقعہ صرف ایک بار یعنی کوہ صفا کا نہ تھا۔ ان تمام احادیث اور دوسری احادیث طبرانی وغیرہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار خطاب عام و خاص کیا تھا۔ خطاب خاص بنوعبدالمطلب اور ان کے افراد اور اپنے عزیزوں سے کیا تھا اور وہ بھی مختلف اوقات میں جیسا کہ حافظ موصوف کا خیال ہے۔ اسی طرح خطاب عام میں قریش کو دعوت اسلام دینے کا واقعہ بھی کئی بار پیش آیا تھا۔ ان میں کوہ صفا کا خطبہ صرف ایک مقام کا ہے۔ بہر حال ابولہب ہاشمی کی مخالفت کے سوا دوسرے قریشی اکابر کے ردعمل کا ذکر ان روایات میں نہیں ہے۔ صرف ابولہب کے ردعمل پر ارتکاز ہے (۱۶)۔ بیشتر اردو سیرت نگاروں نے اس کو ایک واقعہ اور صرف ابولہب کا ردعمل قرار دیا ہے۔ ان میں شبلی، کاندھلوی وغیرہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ صرف اصح السیر کے مولف مولانا دانا پوری نے ''دعوت کا دوسرا دور'' عنوان قائم کر کے اس آیت کریمہ کی تنزیل اور خطاب نبوی کا ذکر کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''ابتداءً اس پر کفار زیادہ نہ بگڑے لیکن جب یہ آیۃ نازل ہوئی: انکم انتم (کذا) **وما تعبدون من دون الله حصب جهنم** '' اور حضور نے بت اور بت پرستی کی خرابیوں کو صاف صاف واضح کرنا شروع کیا تو کفار نے بڑے زور وشور سے عداوت شروع کردی

اور سارے کفار آپ ؐ کی دشمنی پر متفق الکلمہ ہو کر اٹھے اور بڑی شدت سے مخالفت کی'' ۔ یہ سارا بیان بلا حوالہ ماخذ ہے (۱۷) ۔ اس سے زیادہ قریشی اکابر اور ان کے خاص شیاطین کی عداوت نبوی کی صحیح توقیت نہیں کرتا ۔ اس سے پہلے بہت پہلے مخالفت شروع ہو چکی تھی ۔

ابن اسحاق/ابن ہشام نے قریشی اکابر کے سخت ردعمل اور مخالفت کا ذکر خواجہ ابو طالب کی حمایت نبوی کے ضمن میں بیان کیا ہے، انہوں نے ابو طالب ہاشمی کے پاس متعدد اکابر قریش کے وفود کے آنے اور ان کے دعوت نبوی کے بارے میں بات چیت کرنے کا ذکر کیا ہے ۔ ان میں خاص اکابر قریش تھے: اسود بن مطلب بن اسد، ابوجہل (عمرو بن ہشام) مخزومی، ولید بن مغیرہ مخزومی، نبیہ و منبہ فرزندان حجاج بن عامر سہمی اور عاص بن وائل سہمی ۔ مختلف وفود میں دوسرے اکابر قریش کے نام بات چیت کے دوران آتے ہیں جیسے مطعم بن عدی ۔ ان تمام وفود قریش کی ملاقات و بحث کا صرف ایک مرکزی نقطہ تھا کہ ابو طالب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و نصرت سے ہاتھ اٹھا لیں یا ان کو ان کے دین آباء اور خداؤں پر نقد کرنے سے روکیں ۔ آخر آخر انہوں نے یہ تجویز ابو طالب کے سامنے رکھی کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عوض جوان قریش عمارہ بن ولید بن مغیرہ مخزومی کو لے لیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالہ کر دیں تاکہ وہ آپ کو قتل کر دیں ۔ ابو طالب ہاشمی نے اس احمقانہ تجویز مصالحت کو مسترد کر دیا اور اس پر ابو طالب کا شیخ بنو نوفل مطعم بن عدی سے سخت جھگڑا بھی ہوا (۱۸) ۔ ابن اسحاق نے اس روایت کو ''فیما بلغنی'' کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور وہ اس کے ضعف کی علامت ہے ۔ اسی کے بعد قریش کی سخت عداوت شروع ہوتی ہے ۔

موذی اکابر کی فہرست مآخذ: بلاذری وغیرہ نے دوسری طرف اکابر قریش کی ان کی نوعیت مخالفت و عناد نبوی کی بنا پر درجہ بندی کی ہے ۔ مورخ موصوف کے مطابق جو لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں پیش پیش تھے اور سختی کرتے تھے اور لوگوں کو اسلام سے بھٹکاتے تھے ان میں تھے: ابوجہل بن ہشام، ابولہب، اسود بن عبد یغوث (خالہ/ ماموں زاد بھائی)، حارث بن قیس بن عدی سہمی جو ابن الغیطلہ مشہور تھا، ولید بن مغیرہ، امیہ و ابی فرزندان خلف جمحی، ابوقیس بن فاکہ بن مغیرہ، عاص بن وائل سہمی، نضر بن حارث عبدری، منبہ و نبیہ

فرزندان حجاج سہمی ، زہیر بن ابی امیہ مخزومی ، سائب بن ابی السائب صیفی مخزومی ، اسود بن عبدالاسد مخزومی ، عاص بن سعید بن العاص ، عدی بن الحمراء خزاعی ، ابوالبختری العاص بن ہاشم اسدی، عقبہ بن ابی معیط اموی، اسود بن مطلب اسدی، ابن الاصدی الہذلی، حکم بن ابی العاص بن امیہ اور یہ سب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسی بھی تھے: "**وذلک أن هولاء کانوا جیرانه**" لیکن ان میں عداوت نبوی میں جو انتہا پر تھے وہ ابوجہل، ابولہب اور عقبہ تھے۔ان کے علاوہ ابوسفیان بن حرب اور عتبہ وشیبہ فرزندان ربیعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت تو رکھتے تھے لیکن وہ انتہا پسندوں کی طرح عمل نہیں کرتے تھے گویا وہ "جاہل قریش" کی مانند تھے۔ابن سعد میں بھی ان ہی مخالفین ومعاندین کا بیان قریب قریب اسی طرح ہے۔ان کی روایات ان کے استاد کے علاوہ دوسروں سے بھی مروی ہیں۔لیکن یہ پوری فہرست خاص امام واقدی کی ہے اور اس کی تمام تفصیلات اور دوسری عبارات بھی ان سے ابن سعد نے نقل کی ہیں۔محمد بن حبیب بغدادی نے کتاب المحبر میں مخالفین ومعاندین کے چار طبقات بنائے ہیں: الموذون من قریش، المستہزؤن من قریش جو سب کے سب کافروں کی موت مرے، المقسمون (تقسیم کرنے والے) اور زنادقۂ قریش (قریش کے اکابر زندیق) بلاذری نے ان تمام مخالفین ومعاندین کی مخالفت و سوانح اور ان کی تفصیلات ہر ایک کے نام سے "امر فلان" کے عنوان کی تحت بیان کی ہیں (۱۹)۔ یہ دراصل ان تمام اکابر قریش کی عناد اسلام اور مخالفت نبوی کی سوانح عمری ہے جس میں ان کے انجام تک کے واقعات کو شامل کرلیا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ وہ مکی دور سے مدنی دور تک کے عناد و مخالفت حق کی تاریخ ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ان میں بیشتر کی مروت کا ذکر بھی ملتا ہے۔مکی دور میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت وعداوت اکابر کا یہ بیانیہ ہجرت مدینہ تک وسیع ہے۔اور ان کے زمانی مراحل اور تاریخی سلسلے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔یہ صرف دو چار بار کا معاملہ نہیں تھا بلکہ عداوت کی تیرہ سالہ تاریخ ہے۔یہ دراصل عام معاند قریشی اکابر کی فہرستیں ہیں اور ان کی عداوت اسلام کی روایات بھی لیکن وہ سب کے سب صرف مخالف ومعاند ہی نہ تھے۔

تعذیب وعداوت کا اصل دور: قریشی اکابر کی روک ٹوک، ان کے متشددوں کی مار پیٹ

اوران کے دریدہ دہنوں کی دشنام طرازی کے اولین مراحل میں جب ان کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہر بطن و خاندان قریش اپنے اپنے ''باغیوں'' کی سرکوبی کا معاملہ خود اپنے ہاتھ میں لے لے کیونکہ قریشی تحفظ کے نظام کے تحت کوئی غیر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا ورنہ قصاص کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔عرب جاہلی نظام تحفظ کا یہ ایک قابل فخر اور دوررس نتائج کا حامل قبائلی سماجی نظام تھا اوراس کی عظیم جہات تھیں۔وہ صرف قومی، خاندانی یا قریشی فخر وعزت اور ناموس کا معاملہ نہیں تھا بلکہ ان کے دور میں جان و مال کے تحفظ کا ضامن بھی تھا۔(۲۰)

یہی دور کرب و بلا ہے جب ہر خاندان قریش کے دشمن اکابر اور متشدد شیوخ نے اپنوں کی زندگی اجیرن کر دی۔بقول ابن اسحاق ہر خاندان قریش اپنے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا اوران کو طرح طرح سے ستایا، مارا پیٹا اور تنگ کیا۔دس برسوں ۶۱۳ - ۶۲۲ء سے اوپر محیط اس عرصہ میں نوجوان مسلمانوں کے ساتھ اکابر صحابہ تک مظالم کا شکار بنے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مربی چچا ابوطالب ہاشمی کی حمایت وتحفظ کے باوجود موذی اکابر قریش کے سخت مظالم سے نہ بچ سکے۔اسی عرصہ آزمائش میں دشمن جان وایماں عقبہ بن ابی معیط اموی کبھی آپؐ کی گردن مبارک میں چادر کا پھندا ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا اور کبھی مسجد حرام میں نماز کے دوران بحالت سجدہ آپؐ کی پشت مبارک پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ کر کمر توڑنے کی سعی کرتا رہا۔اس غیر اخلاقی اور غیر انسانی سلوک کے باعث وہ اکابر قریش تھے جو مسجد حرام میں خاص مقام حجر میں اپنی مسانید پر فروکش رہتے تھے۔ان کا تعارف وتذکرہ اتنا اہم نہیں جتنا یہ واقعہ کہ صلح پسند اور معتدل اکابر قریش ان ظالموں کے ہاتھ نہیں باندھ سکتے تھے اور مسوس کر رہ جاتے۔سب سے اہم اور معنی خیز ابوطالب ہاشمی کی حمایت نبوی کی کمزوری تھی کہ وہ ان ظالموں کے مسلسل مظالم سے بچانے میں ناکام رہی۔ مآخذ میں ابن اسحاق و بخاری وغیرہ کا ایک عمومی اور سکہ بند جملہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کی حفاظت حاصل تھی لیکن کس قدر؟ حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلیؓ کے بقول عام کمزور مسلمین (مستضعفین) ٹک ٹک دیکھتے تھے اور کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و مدافعت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا کارنامہ قابل قدر ہے کہ متعدد مواقع پر آپؐ کی حفاظت کی تھی اوران سے زیادہ بلکہ عظیم ترین دفاعی وحفاظتی کارنامہ حضرت فاطمہؓ کا تھا کہ نوجوان

اور وہ بھی عورت ذات ہونے کے باوجود حفاظت نبوی کی تھی۔(۲۱)

خاندان اکابر قریش کے اپنوں پر مظالم اور خاص کر کمزور مسلمانوں پر ظلم وستم کرنے والے دوسرے واقعات ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے عمومی تعذیب مسلمین کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لوہے کی زنجیریں پہناتے ، دھوپ میں کھڑا رکھتے تھے، یہ صرف ایک روایت ہے۔ ان میں نئے نئے ظالموں کے ظلم وتعذیب کا ذکر نام بنام ملتا ہے۔ ان کے ناموں اور کرتوتوں کا ایک مختصر ذکر درج ذیل ہے:

ابوجہل مخزومی ، ابولہب ہاشمی ، عقبہ بن ابی معیط اموی کے علاوہ دوسرے ایذا دینے والوں کا ذکر بلاذری نے خاص فصل میں کیا ہے۔

عام اکابر قریش کے علاوہ امیہ بن خلف جمحی حضرت خباب بن ارت تمیمی کو دھوپ میں کھڑا رکھتا اور مارتا پیٹتا تھا۔ ان کو ان کی کھٹالی کے انگاروں پر لٹا دیتا اور وہ ان کی پشت کی چربی سے کوئلہ بن جاتے ، وہ اس کے بعد بھی مظالم کا سلسلہ جاری رکھتا۔ عاص بن وائل سہمی نے حضرت خباب بن ارت تمیمی کا مال /دین دبا لیا تھا اور کبھی نہیں ادا کیا۔ دوسروں نے ہجرت کے وقت سارا مال ضبط کرلیا۔ حضرت خباب پر مظالم قریش کی روایات بخاری و بلاذری وغیرہ یکساں الفاظ ومطالب پر مبنی ہیں۔ ان کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہیے۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کو ان کے چچا حکم بن ابی العاص اموی رسی سے باندھ دیتے اور دھوئیں کی دھونی دیتے تھے۔

حضرت سعید بن زید بن عمروؓ کو ان کے برادر نسبتی حضرت عمر بن خطابؓ اپنے جاہلی ایام میں رسی سے باندھ دیا کرتے تھے۔ بخاری کی حدیث: ۳۸۶۲ وغیرہ میں ان کے حضرت عامر بن فہیرہ کے ساتھ باندھنے اور اذیت دینے کا ذکر ہے۔ وہ کئی لحاظ سے اہم ہے کیونکہ حضرت سعید بن زیدؓ کافی معمر اور بااثر شخص تھے اور ان کے خاندان کے بھی تھے جبکہ حضرت عامر بن فہیرہ تیمی حلیف تھے۔ مکہ مکرمہ کی صحابیات حضرت زنیرہ اور حضرت لبیبہ رضی اللہ عنہما کو بے تحاشا مارنے پیٹنے کا واقعہ جاہلی سوانح عمری کا ایک باب ہے۔

ابواحیحہ سعید بن العاص اموی اپنے دو قدیم الاسلام فرزندوں حضرات خالد وعمرو رضی اللہ

عنہما کو خانہ قید کر دیتے اور ان کا کھانا پینا بند کر دیتے۔ وہ حضرت عثمان بن عفان اموی اور بعض دوسرے اموی عزیزوں کے بھی درپے آزار رہے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیر عبدریؓ کی کافر ماں ہی ان پر ظلم و ستم ڈھاتی اور کھانے پینے سے محروم کر کے خوش ہوتی۔

سردار مکہ اور خطیب قریش سہیل بن عمرو عامری نے اپنے فرزند دلبند حضرت ابوجندلؓ اور ان کے بھائیوں کو لمبی مدت تک خانہ قید رکھا، ان کو لوہے کی بیڑیاں پہنائیں اور ان پر ظلم و جبر کی ایک عامری تاریخ رقم کی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسے با اثر و محبوب منصب دار قریش کو ان کے خاندان بنوتیم کے علاوہ دوسرے اکابر قریش اذیت دیتے۔ ابن العدویہ کے نام سے مشہور ایک شیطان قریش نوفل بن خویلد اسدی حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ کو ایک رسی میں باندھ دیتا۔(۲۲)

مکی مسلمانوں کی تعذیب کے باب میں قریشی اکابر بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے اور جو ہاتھ آ جاتا اس کی کندی کرتے۔ ان میں مشہور عام اکابر قریش تو شامل تھے ہی دوسرے درجہ کے شیوخ اور سادات بھی تھے جیسے عمر بن خطاب عدوی (اسلام سے قبل)، نوفل بن خویلد اسدی (ابن العدویہ اسدی)، صفوان بن امیہ جمحی، سہیل بن عمرو عامری وغیرہ۔

اوباشوں کا استعمال: قریشی اکابر تعذیب و تادیب کے لیے نت نئے طریقے اور نفسیاتی حملے تلاش کر کے مخالفت کا اظہار کرتے۔ لڑکوں، بالوں اور شریروں کو مسلمانوں کی تعذیب کے گر سکھاتے اور ایک طرح سے عوامی ایذا رسانی کے طریقے اختیار کرتے۔ مآخذ کا بیان ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں اور غلام و موالی کو رسی یا لوہے کی بیڑیوں سے باندھ دیتے اور نکیل ان شریروں کو تھما دیتے۔ حضرات بلال و عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہما کے اذیت ناموں میں بلاذری وغیرہ نے لڑکوں (صبیان) کے رسی سے کھینچنے کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام اور صحابیات طاہرات کو سزا دینے کے لیے اکابر قریش نے لڑکوں بالوں کا استعمال کیا تھا۔ سماجی تعذیب اور نفسیاتی تکلیف کا قریشی رویہ بتاتا ہے کہ صرف مشہور اکابر ہی ظلم و ستم کے خوگر نہ تھے، بلکہ انہوں نے عوام و خواص سب کو اپنا آلہ کار بنایا تھا اور ان کے ذریعہ وہ مکہ مکرمہ میں دہشت

گری اور تشدد کی عوامی تحریک برپا کی تھی۔ یہ صرف قریشی اکابر کا سماجی رویہ نہ تھا۔ دوسرے دیار و امصار میں بھی اس پر عمل ہوتا تھا جیسا کہ سفر طائف کے دوران نظر آیا تھا (۲۳)۔ سفیہان قوم کا یہ دلچسپ مشغلہ تھا اور ان کو گمراہ کرنے والے اکابر قوم ہوتے تھے، جیسا کہ ابن اسحاق، بخاری وغیرہ میں ان کا حوالہ ہے۔

صرف اکابر قریش ہی نہیں پورے پورے خاندان اور ان کے عوام و خواص اجتماعی مظالم ڈھانے میں طاق تھے، کیونکہ ان کی فطرت تعذیب اسی سے تسکین پاتی تھی۔ مآخذ نے ان میں سے متعدد بطون کی تعذیب کی روایات دی ہیں۔ جیسے ابوفکیہہؓ کو ان کا آقا صفوان بن امیہ جمحی اتنا نہ ستاتا تھا جتنا کہ امیہ بن خلف جمحی اور ان سے زیادہ بنوعبدالدار عذاب دیتے تھے۔ بنوعبدالدار نے حضرت نہدیہؓ کو سخت عذاب دیا تھا۔ ان میں سے کچھ کمزور خواتین کی بینائی چلی گئی تھی اور بعض کے حواس ہی گم ہوگئے تھے۔ عام موذیوں کو مآخذ میں سفہائے قریش (بیوقوف اکابر) اور جہلہ قریش (بے بصیرت لوگ) قرار دیا گیا ہے کہ صرف اکابر قوم کی پیروی میں حد اعتدال سے نکل جاتے تھے بلکہ تعذیب مسلمین میں بڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یہ بھیڑ چال اور ایذا دہی کی عوامی فطرت تھی۔ (۲۴)

مظالم روکنے والے اکابر قریش: ابن اسحاق، ابن سعد اور بلاذری کے عام اخبار کے علاوہ ایسی روایات بھی ہیں جو خاص ظالم اکابر کا ذکر کرتی ہیں۔ ان میں سے متعدد بڑے اکابر قریش بھی شامل تھے جیسا کہ بلاذری نے عتبہ، شیبہ اور ابوسفیان کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اموی خاندان کے ان اکابر کے متعلق مکی دور میں ایک روایت بھی نہیں ملتی جو ان کو قریش کے موذیوں میں شامل کرنے کا جواز پیدا کرے۔ متعدد اکابر قریش کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ دین اسلام قبول کرنے کے مخالف تھے لیکن مظالم کرنے کے حق میں بھی نہ تھے بلکہ ان میں بیشتر نے تو ظلم و ستم سے مسلمانوں کو بچانے کا کام بھی کیا تھا۔ عتبہ، شیبہ، ابوسفیان وغیرہ اس گروہ میں شامل تھے۔ ان کے بارے میں روایات کی یہ تصریح بھی ملتی ہے کہ وہ اپنی قوم قریش سے بیکراں محبت کرتے تھے اور اس وجہ سے تعذیب کے مخالف تھے۔ حضرت ابوسفیان امویؓ مکی دور میں نہ صرف ظلم و ستم کے قریب نہیں گئے تھے بلکہ اپنے مشہور حلم و کرم اور محبت قریش کے پیکر عظیم

تھے۔ تمامتر دینی اختلاف کے باوجود وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجارت کے شریک رہے اور عام مسلمانوں سے بھی ان کا سلوک اچھا رہا۔ (۲۵)

ان میں سے ایک بڑے سردار ابوقیس بن الاسلت وائلی اوسی اگر چہ مدنی تھے لیکن مکہ میں قیام پذیر تھے۔ وہ قریش کے داماد (صہر) تھے کہ ان کے حرم میں ارنب بن اسد بن عبدالعزیٰ تھیں اور وہ قریش سے بہت محبت کرتے تھے۔ ابن اسحاق ۱۷۹/۱، قریش کو جنگ و جدال سے اور محض دین کے اختلاف کی وجہ سے ستانے سے بھی روکا کرتے تھے۔

حضرت حکیم بن امیہ سلمیؓ بنو امیہ کے حلیف تھے۔ وہ اپنی قوم کو عداوت نبوی اور عناد اسلام سے روکا کرتے تھے اور ان کا اثر بھی تھا۔ کہنے کو وہ حلیف اور غیر قریشی تھے لیکن قریش میں وہ ''شریف مطاع'' سمجھے جاتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور محترم اکابر میں شامل بھی۔

عتبہ بن ربیعہ عبشمی کی مشہور ملاقات و مکالمہ کے ضمن میں آتا ہے کہ وہ جب زبان رسالت مآب سے قرآن مجید سن کر اپنے قومی اکابر کی مجلس میں واپس گئے تو سخت متاثر تھے اور اسی کے بعد قوم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حال پر چھوڑ دیں، کیونکہ آپ کا معاملہ عظیم ہے جو واقعہ بنے گا۔ اگر عرب نے ان کا خاتمہ کر دیا تو تمہارا مقصود تمہیں مل جائے گا اور اگر آپ عرب پر غالب آ گئے، تو آپ کا ملک تمہارا ملک، ان کی عزت و جاہ تمہارا سرمایہ افتخار ہوگا اور ان کے سبب تم معزز و سعید ترین ہو جاؤ گے۔ (۲۶) ابن اسحاق ۱۸۵/۱-۱۸۶۔

ابوالبختری عاص بن ہشام بھی ان مصلحین قوم میں شامل تھے جو ظلم و ستم کرنے کے خلاف تھے اور ظالموں کو روکتے تھے۔

معتدل و انصاف پسند اکابر قریش: مآخذ سیرت میں مندرج فہرستوں میں بہت سے اکابر قریش کو معاندین اور موذیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ ان کی بنا پر جدید سیرت نگاروں نے ان سب کو بلا تامل دشمنان دین و رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل کر کے ان کے مظالم کا عام ذکر کیا ہے۔ تجزیہ و تحلیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان میں سے متعدد اکابر قریش اسلام کے خلاف تھے لیکن ایذا دینے کے حق میں بھی نہ تھے۔ ایک منصفانہ تجزیہ کے مطابق نئے دین یا اسلام کی مخالفت تو چند اشخاص کے سوا سب نے کی تھی۔ ان اکابر قریش میں معتدل اور انصاف پسند لوگ

بھی تھے اور عام روایات سیرت میں ان کے مظالم کا ذکر بالکل نہیں کیا جاتا۔ان میں شامل تھے:

ابوسفیان بن حرب اموی، ابوالبختری عاص بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ عبشمی، شیبہ بن ربیعہ عبشمی، عاص بن وائل سہمی، ولید بن مغیرہ مخزومی، نضر بن حارث عبدری۔

قدیم مولفین سیرت کی انصاف پسندی بھی ہے کہ اس عام فہرست اعداء میں سے متعدد کے بارے میں یہ بھی بعد میں صراحت کر دیتے ہیں کہ وہ دین قبول کرنے والے نہ تھے یا اسلام کے خلاف تھے لیکن وہ کسی طرح ایذاء و تکلیف کے قائل نہ تھے۔ان منصف مزاجوں یا معتدل اکابر کو وہ جاہل قریشی اکابر کہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ احمقان قوم۔ان میں سے بعض صاحب علم اکابر جیسے نضر بن حارث عبدری نے اسلامی تعلیمات اور قرآنی آیات کی علمی، فکری اور لسانی اور ادبی مخالفت ضرور کی تھی۔متعدد دوسروں کو بھی اسلامی تعلیمات اور نبوی تنقیدات سے اختلاف تھا بلکہ وہ ان پر اپنے اعتراضات بھی کرتے تھے۔ان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے حامی اور کفیل ابوطالب ہاشمی بھی شامل تھے اور دوسرے ہاشمی و مطلبی غیر مسلم اکابر بھی۔ایسے اکابر دوسرے بطون قریش میں بھی تھے اور ان کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ان کی مخالفت یا موافقت کا ذکر روایات میں ملتا ہے۔(۲۷)

ہجرت حبشہ کا باعث مظالم: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشی اکابر اوران کے گرگوں کے ہاتھوں مظالم سہتے دکھ ہوتا تھا۔آپ اس کا مداوا کرنا چاہتے تھے۔مآخذ کا یہ بیان جزوی طور پر صحیح ہے کہ آپ اپنے چچا ابوطالب ہاشمی کی حمایت ونصرت کے سبب مامون و محفوظ تھے لیکن ایسا قطعی تحفظ نہ تھا۔بہرحال آپؐ نے نوجوان قریش اور مظلومان قوم کو حبشہ ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔مآخذ نے خاندان وار مہاجرین حبشہ کی ہجرت، مصیبت اور آزمائش کا ذکر کیا ہے۔ان میں تمام خاندانوں کے بےکس صحابہ شامل تھے۔حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کی ہجرت حبشہ سب سے اہم ہے اس معنی میں کہ ابوطالب اپنے مسلم فرزند کی حفاظت نہ کر سکے۔اسی طرح دوسرے معتدل اور حامی اکابر قریش بھی اپنے عزیزوں، فرزندوں، دلبندوں اور عورتوں بچوں کی حفاظت سے قاصر رہے۔مہاجرین حبشہ کی فہرست سے ان کے قلق واندوہ کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے جبر وظلم کے اساطین کے سامنے جھکنے کا بھی۔ابن اسحاق وغیرہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے سوا دوسرے اہل ایمان کے تحفظ و دفاع کے ضمن میں ابو طالب کی لاچاری کا اظہار بھی کیا ہے۔ اگرچہ دوسرے اکابر قریش کے مظالم کے خوگر قریشیوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے کا ذکر روایات میں نہیں ہے لیکن وہ ظاہر ہے۔ دربار نجاشی میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے عظیم الشان خطبہ میں اکابر قریش کے مظالم کو باعث ہجرت بتایا گیا ہے۔

بلاشبہ اکابر قریش کی اکثریت کو ان کے شکاروں کے ہاتھ سے نکل جانے پر سخت اندوہ و غصہ بھی تھا، کیونکہ وہ اسے اپنی قومی توہین کے مترادف سمجھتے تھے۔ مہاجرین حبشہ نے ان کے سماجی اقتدار اور قومی غیرت کو للکارا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ان کو واپس مکہ لانے کے جتن میں لگ گئے اور پے در پے دو وفود بھیجے کہ فراریوں کو واپس وطن لاسکیں۔ سفیران قریش خاص کر ان کے سیاستداں و داہیہ حضرت عمرو بن العاص سہمی کی مقصد میں ناکامی نے ان کو برافروختہ کردیا تھا۔ اس کے باوجود ان کے دلوں میں ایک پھانس بھی تھی کہ ان کے اپنے عزیز و اقارب اور جگر کے ٹکڑے پردیس میں غریب الوطن بن گئے۔ اس کا اظہار ان اشعار سے بھی ہوتا ہے جو اس واقعہ ہائلہ کے باب میں اکابر قریش اور مسلم مہاجرین کے شعراء نے کیے تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ اپنے خاندانی حلیف حضرت عامر بن ربیعہ عنزی اور ان کی اہلیہ لیلیٰؓ کی ہجرت پر خاصے مضطرب رہے تھے۔(۲۸)

صلہ رحمی کرنے والے اکابر: دینی اختلاف و سماجی تصادم کے باوجود متعدد اکابر قریش کو اپنے خاندانی یا قومی رشتہ کا پاس و لحاظ بھی رہتا تھا۔ یہ عجیب و غریب فطرت عرب تھی کہ ان کے اکابر ظلم و تشدد کرنے کے باوجود دوسرے مواقع پر محبت و مدارات کا اظہار کرتے تھے۔ ان میں بعض شیطان صفت اکابر قریش بھی شامل تھے جن کا دل صلہ رحمی اور قومی تعلق کے جذبات سے کبھی کبھی بھڑکنے لگتا تھا۔ ابولہب ہاشمی کی عداوت و عناد ضرب المثل تھی مگر اسی کے ساتھ وہ اپنے دوسرے عزیزوں خاص کر اپنے ایک بھانجے کے بارے میں مہر آمیز بھی تھا۔ اس کا ذکر مہاجرین حبشہ کے جوار اکابر قریش کے ضمن میں آتا ہے۔ خاص نکتہ یہ تھا کہ وہ اپنے متشدد اکابر سے لڑ گیا تھا۔

امیہ بن خلف جمحی شدید ترین مخالف اسلام اور دشمن نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھا اور اس کا بھائی ابی بن خلف بھی تھا۔ ابی بن خلف نے کھانا پکوایا اور حلقۂ قریش کو دعوت دی۔ اس میں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت قبول کرلی اور اس کے گھر کھانا کھانے گئے۔اس کے دوست وندیم عقبہ بن ابی معیط اموی نے دعوت نبوی پر سخت سرزنش کی۔تو ابی بن خلف نے جواب میں کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانا کھلانا چاہتا تھا اور میرا دل نہیں مانا کہ ان کو چھوڑ کر دوسروں کو دعوت دوں۔امیہ بن خلف جمحی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ کے دوست وشریک تھے۔اختلاف دین کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی مدارات کرتے تھے۔مدینہ منورہ کے دونوں سرداران اوس وخزرج سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ مکہ آمد پر اسی کے گھر ٹھہرتے تھے اور امیہ مدینہ جاتا تو وہ ان کے پاس ہی قیام کرتا تھا۔دونوں نے ہجرت مدینہ سے قبل باہمی دوستی اور شراکت وتحفظ کا ایک معاہدہ بھی کیا تھا۔(۲۹)

عظیم ترین اکابر قریش میں سے عتبہ بن ربیعہ عبشمی اور ان کے برادر اکبر شیبہ عبشمی سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والوں میں تھے۔طائف کے سفر مشہور سے واپسی پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کے باغ میں پناہ لی تھی اور دونوں نے آپؐ کی تواضع کی تھی۔

عاص بن وائل سہمی،مطعم بن عدی نوفلی،ولید بن مغیرہ مخزومی اور حضرت حکیم بن حزام اسدی جیسے اکابر بھی تھے۔بہت سے گمنام افراد وشخصیات اور اکابر تھے جو صحیفہ مقاطعہ کے نفاذ کے زمانے میں اپنے عزیزوں کی سامان ضرورت سے مدد کیا کرتے تھے۔

مہاجرین حبشہ کو واپس لانے والے وفد قریش کے ایک رکن عبداللہ بن ابی ربیعہ نے حضرت عمرو بن العاص سہمی کے ایک خطرناک حربہ سفارت کو استعمال کرنے سے روکا تھا کہ ایسا نہ کریں،وہ بہرحال ہمارے عزیز ہیں اگرچہ انہوں نے ہماری مخالفت کی ہے۔حضرت عمرو بن العاص سہمی نے پہلی پیشی کی ناکامی کے بعد کہا تھا کہ کل میں ایسی کاری گری کروں گا جو ان مہاجرین کی جڑ ہی کاٹ دے گی۔(۳۰)

تعلیقات وحواشی

(۱) ابن اسحاق/ابن ہشام،السیرۃ النبویۃ،مرتبہ حمدی بن محمد آل نوفل،مکتبۃ المورد،قاہرہ ۲۰۰۶ء،۱/۱۶۸ (آیندہ صرف ابن ہشام)۔ ابن سعد،الطبقات الکبریٰ،طبع جدید داراحیاء التراث العربی،بیروت غیر مورخہ

(چار مجلدات میں : آیندہ ابن سعد) ۹۶/۱ ۔ بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق د۔ یوسف المرعشلی، المعہد الالمانی للابحاث الشرقیہ/موسسۃ الریان بیروت ۲۰۰۸ء، ۲۸۱/۱ (آیندہ بلاذری)۔ سہیلی، الروض الانف، تعلیق مجدی بن منصور بن سید الشوری، دار الکتب العلمیہ بیروت ۲۰۰۹ء (چار مجلدات میں) ۴/۲ و مابعد (آیندہ سہیلی)۔ شبلی، سیرۃ النبی، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء، ۲۰۹/۱ و مابعد (آیندہ شبلی)۔ کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، دار الکتاب دیوبند غیر مورخہ، ۱۷۴/۱ و مابعد (آیندہ کاندھلوی)۔ مودودی، سیرت سرور عالم، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۱۹۸۹ء، ۴۹۳/۲ و مابعد (آیندہ مودودی)۔ داناپوری، اصح السیر، کتب خانہ نعیمیہ دیوبند غیر مورخہ طبع جدید، ۲۸ و ماقبل (آیندہ صرف داناپوری)۔ (۲) مودودی ۵۱۵/۲ - ۵۱۶؛ کاندھلوی ۲۰۳/۱ نے اسلام کی علی الاعلان دعوت اور بت پرستی کی مذمت میں وجہ تلاش کی ہے اور خود تفہیم القرآن میں مختلف مقامات پر مخالفت کا زمانہ بعد کا بتایا ہے۔ اس پر ایک تحقیقی بحث کی ضرورت ہے۔ (۳) محمد حمید اللہ، محمد رسول اللہ، اردو ترجمہ نذیر حق، نقوش رسول نمبر ۱۹۸۲ء، ۵۵۱/۲-۵۵۲ (آیندہ محمد حمید اللہ)۔ (۴) شبلی ۲۱۱/۶- ۲۲۰: مخالفت کے اسباب خمسہ میں سے تیسرا اور چوتھا سبب تاریخی واقعات اور اسلامی حقائق سے بالکل ثابت نہیں ہوتا، قریش نے یہ کبھی نہیں سمجھا کہ آپؐ عیسائیت قائم کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی بنو امیہ نے قبائلی رقابت سے اسلام کی مخالفت کی۔ موخر الذکر خیال مولانا کی فکر کا ترجمان ہے۔ (۵) سورہ زخرف: ۳۱ ''وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ '' مودودی نے اس سورہ کے زمانہ سخت عناد نبوی کا قرار دیا ہے جب آپؐ کی جان لینے کے درپے ہو گئے تھے۔ یہ تعیین وقت صحیح نہیں ہے صرف فہم و ذوق پر مبنی ہے۔ ابن کثیر دمشقی، تفسیر القرآن العظیم، تفسیر آیت کریمہ (آیندہ ابن کثیر)۔ دو قریوں سے ان کی مراد مکہ و طائف تھے اگرچہ امام موصوف نے اس سورہ اور خاص کر اس آیت کریمہ کے شان نزول سے بحث نہیں کی تاہم وہ ابتدائی دور مخالفت کی سورہ لگتی ہے۔ ان کے مطابق رجل عظیم سے مراد روایت حضرت ابن عباسؓ کے مطابق ولید بن مغیرہ مخزومی اور مسعود بن عمرو ثقفی تھے۔ یہی مراد متعدد مفسرین کی ہے۔ دوسری روایت ولید بن مغیرہ اور عروہ بن مسعود ثقفی کو، تیسری روایت عمیر بن عمرو بن مسعود ثقفی اور عتبہ بن ربیعہ عبشمی کو بتاتی ہے۔ حضرت مجاہد کی ایک اور روایت میں مکہ کے عتبہ بن ربیعہ اور طائف کے ابن عبد یالیل مراد تھے، سدی نے ولید بن مغیرہ اور کنانہ بن عمرو بن عمیر ثقفی کو مراد لیا ہے۔ حافظ موصوف کا نتیجہ صحیح ہے کہ ان سب کی مراد کبیر سرداران مکہ و طائف تھے۔ سورہ زخرف اور اس کے زمانے کی تمام مکی سورتوں میں قریش کے اکابر اور دشمنان قوم کے

مخالفت کرنے کا ذکر ضرور ہے مگر قتل نبوی وغیرہ کا خیال نہیں ملتا نہ حوالہ، سخت عداوت کے زمانے میں بھی وہ مسلم کی جان کے درپے نہ ہوئے تھے۔ ان سورتوں کا تجزیہ الگ موضوع ہے۔ (۶) ''غلام بنوعبدالمطلب'' سے مراد مروجہ معنی میں غلام و چاکر نہیں ہے۔ وہ سید، شیخ، عظیم اور کبیر جیسے الفاظ کا فروتر اظہار ہے، اکابر قریش کی نظر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کے پختہ کار مرد اقدس ہونے کے باوجود ابھی جوان تھے اور جوانوں کے زمرہ میں شامل۔ حدیث وسیرت میں ایسے تمام بے منصب و جاہ افراد قوم ''غلامان قریش وعرب'' میں شمار کیے جاتے تھے۔ (۷) بلاذری ۲۸۲/۱: ''استخفینا بالاسلام سنة ، ما نصلی الا فی بیت مغلق ، او شعب قال ینظر بعضنا لبعض'' ۔ بلاذری ۲۷۶/۱: '' ...... وکان اذا صلّٰی فی سائر الیوم ، بعد ذلک قعد علی او زید یرصد له'' ۔ دوسرے مآخذ میں بھی قریشی نگرانی، تجسس، تعاقب اور پتہ لگانے کی جبلت کے واقعات واخبار ملتے ہیں۔ وہ ان کی جستجو کے بھی نتیجے تھے کہ کیا دین ہے اور کیا ہو رہا ہے؟ اعلان حق وتنزیل قرآن کے بعد ان کا تجسس فطری تھا جو حالات کے تحت ناکہ بندی میں بدلنے لگا۔ (۸) بلاذری ۲۸۲/۱-۲۸۳؛ ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/ ۱۶۷-۱۶۸ ومابعد: اول الذکر کا بیان ہے کہ ان اکابر قریش نے پتہ لگایا تھا جبکہ موخر الذکر کے بیان سے لگتا ہے کہ مشرک شیوخ کا نفر اچانک آ گیا تھا۔ جدید سیرت نگاروں نے اسی کو قبول کیا ہے۔ (۹) بلاذری ۲۸۴/۱-۲۸۵، اس روایت میں دو اہم نکات ہیں: ایک یہ کہ روایات سیرت میں سے وہ روایت زیادہ معتبر ہے جو یہ بتاتی ہے کہ آغاز نبوت سے دو وقت کی نمازیں فرض کی گئی تھیں: ایک نماز صبح اور دوسری نماز عصر۔ قرآن مجید میں بھی دن کے آغاز اور سورج کے غروب سے قبل نمازوں کا وقت مکی آیات میں بتایا گیا ہے: جیسے سورہ طٰہٰ: ۱۳۰؛ سورہ ق: ۳۹۔ دونوں سورتیں ابتدائی مکی دور کی ہیں۔ دوسرے اسی خفیہ زمانہ میں قریشی اکابر مسلمانوں کے آمد ورفت اور حرکت پر نظر رکھتے تھے اور پیچھا کرکے پتہ لگاتے تھے۔ (۱۰) بلاذری ۲۸۳/۱-۲۸۴: ...... وکان ابوه قد اخرجته قریش مکة ...... ۔ حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدویؓ پر روایات سیرت میں بہت اختلاف بھی ہے اور ابہام بھی۔ ان پر ایک خاص تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے۔ ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/ ۱۴۸-۱۵۳: ان کے قریب ترین عزیز خطاب بن نفیل جو حضرت عمر فاروقؓ کے والد تھے حضرت زید کے چچا بھی تھے اور ماں جائے بھائی بھی اور وہ ان کے آبائی دین چھوڑنے پر عتاب کرتے تھے حتی کہ ان کو بالائی مکہ کی طرف نکال دیا اور بدقماشوں کو ان کے پیچھے لگا دیا کہ مکہ نہ آنے پائیں۔ (۱۱) مآخذ میں خاص کر بلاذری میں اکابر قریش کے مسلمانوں کی تاک میں رہنے اور ان کے

آثار قدم سے ان کے خفیہ مقامات عبادت کا پتہ لگانے کی متعدد روایات ملتی ہیں اور تو اور رسول اکرمؐ کے حامی و مددگار جناب ابوطالب ہاشمی نے اسی طرح نمازیوں کا پتہ لگایا تھا، جس کا ذکر اوپر آتا ہے ۔ (۱۲) ابن اسحاق / ابن ہشام ۱/۱۶۲:''...... ثم ان ابا طالب عثر عليهما يوما وهما يصليان'' اس روایت میں اور دوسری متعدد روایات میں یہ واضح طور سے کہا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے شروع سے اپنے دین کو ''اصل دین ابراہیم علیہ السلام'' کہا تھا اور اس کی تصدیق مزید مکی سورتوں سے ہوتی ہے ۔ بلاذری ۱/۲۷۵-۲۷۶ نے اسلام حضرت علیؓ کے باب میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ رسول اکرمؐ کے پاس آتے تھے اور ابوطالب کے خوف کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے ۔ ابوطالب نے ایک دن حضرت علیؓ کو گم پایا تو ان کی اہلیہ محترمہ حضرت فاطمہؓ بنت اسد ہاشمی نے ان سے کہا کہ میں نے اس کو محمدؐ کے ساتھ مستقل لگا ہوا پایا ہے اور مجھے خوف ہے کہ محمدؐ کی طرف سے آپ کو اپنے بیٹے کے بارے میں کوئی ایسی بات ملے جس کی تاب نہ لاسکیں ۔ ابوطالب نے حضرت علیؓ کے اس اقدام کو جسارت پر محمول کیا اور پھر انہوں نے رسول اکرمؐ اور حضرت علیؓ کے اثر کا تعاقب کیا اور ان دونوں کو اس حال میں پایا کہ رسول اکرمؐ نماز عصر پڑھ رہے تھے اور حضرت علیؓ ان کی نگہبانی کررہے تھے: ''...... واتبع ابو طالب اثر النبي صلى الله عليه وسلم واثر علي رضي الله عنه فوجدهما ، ورسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي العصر في شعب ابي دب او غيره وعلي رضي الله عنه ينظر له'' ۔ حضرت علیؓ کے قبول اسلام اور اس پر ان کے والدین کے ردعمل سے زیادہ دلچسپ قریشی ردعمل ہے ۔ ابوطالب نے جب حضرت علیؓ کو رسول اکرمؐ کی پیروی کرنے کی اجازت دے دی تو ان کی اہلیہ نے حضرت علیؓ کے بارے میں خبر دی ۔ ابوطالب نے ان کو تنبیہ کی کہ خاموش رہو اور اس بات کو دل سے بھلا دو ۔ بلاشبہ وہ اپنے ابن عم کی حمایت و امداد کرنے کا زیادہ حقدار ہے ۔ اگر میرا نفس دین عبدالمطلب کے ترک پر آمادہ ہوجاتا تو میں محمدؐ کی پیروی کرتا کیونکہ وہ حلیم، امین و طاہر ہیں ۔ وہ تو خاموش ہوگئیں مگر یہ بات قریش تک جا پہنچی تو وہ ان کو شاق و ناگوار گذری:''...... وبلغ قريشا فراعهم وكبر عليهم'' ۔ اخبار رسول اللہؐ اور اسلامی دعوت کا عام ہونا ایک سماجی اور فطری معاملہ تھا ۔ جب رسول اکرمؐ نے اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کیا اگرچہ عام دعوت مخفی رکھی تو وہ واقعہ ہی ان اکابر کے لیے حیرتناک تھا اور قریشی افراد کا مسلمان ہونا، نمازیں پڑھنا، گھروں سے غائب رہنا ان کے جستجو کے لیے کافی تھا ۔ (۱۳) بلاذری ۱/ ۲۸۶-۲۸۸؛ جدید سیرت نگاروں میں سے بیشتر نے صرف ابن ہشام پر انحصار کیا ہے یا تفسیر سورہ لہب کی

روایات پر ابولہب ہاشمی کا قومی خدشات وخطرات کا اظہار محض عداوت پر مبنی نہیں تھا، وہ بڑی حد تک واقعی تھا کہ کار دعوت اسلامی پھیلنے پر قوم قریش کی مخالفت ضرور ہوگی اور صرف ایک بطن قریش اس کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔
(۱۴) بلاذری ۲۸۹/۱-۲۹۱: بلاذری نے بالترتیب عباس بن ہشام، ابن سعد اور محمد بن حاتم مروزی سے ان کو روایت کیا ہے۔ بخاری رفتح الباری، کتاب التفسیر، سورہ تبت یدا ابی لہب (آئندہ بخاری رفتح الباری)۔ اول الذکر حدیث میں اس کے نزول کا زمانہ آیت کریمہ: "وانذر عشیرتک الاقربین" کے نزول کا بعد قرار دیا ہے مگر اس میں آیت کریمہ کے بعد ایک اور جملہ ہے: "ورھطک منھم المخلصین" جو حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے مطابق حضرت اعمش سے ابواسامہ کی روایت پر مبنی ہے۔ حافظ موصوف نے سورہ شعراء میں اس حدیث اور اس کے مباحث پر اپنی بحث کا یہاں حوالہ دیا ہے۔ فتح الباری ۶۳۷/۸-۶۳۹ میں یہ اضافہ ہے کہ امام طبری نے اس منسوخ آیت کو موصول روایت کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ آپ یا وہ اسی طرح پڑھتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے حسب عادت اس کے نزول کو عام وخاص بنا کر تاویل کی ہے مگر اس سے قبل شرح مسلم میں امام نوویؒ کے "تعقب" کا ذکر کیا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس کی تخریج ہی نہ کی تھی۔ (۱۵) بخاری رفتح الباری ۸/ ۶۳۶ ومابعد۔ "ورھطک منھم المخلصین" کے دوسری بار نازل ہونے سے بحث کی ہے جو امام قرطبیؒ کے مطابق بعد میں منسوخ التلاوۃ ہوگئی۔ حافظ موصوف نے مختلف اصحاب وخواتین سے خطاب نبوی پر بحث کی ہے جو بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ بحث حافظ میں واقدی، ابن اسحاق، طبری اور بیہقی کی روایات کے واسطہ سے صراحت کی ہے اولاً یہ دعوت نبوی صرف بنو ہاشم وبنو مطلب کے لیے تھی اور ان کے چالیس سے اوپر یا کم مردان کار مخاطب تھے اور ان اعمام نبوی ابوطالب، حمزہ، عباس اور ابولہب بھی تھے۔ (۱۶) فتح الباری ۸/ ۶۳۶-۶۳۹: حافظ موصوف نے اس قصہ کے صرف دوبار واقع ہونے کی صراحت کی ہے: "ھذہ القصة وقعت مرتین" حالانکہ ازواج مطہرات میں سے بعض کے حوالہ پر ان کا خیال ہے کہ وہ مدینہ کا واقعہ ہے جیسا کہ طبرانی میں ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ بار بار دعوت عام دیتے تھے۔ آیت سورہ شعراء کا حوالہ نزول کے حوالے سے آتا ہے حالانکہ وہ تلاوت نبوی کا معاملہ ہے۔ ایک اور روایت نقل کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے ان کو کھانے کی دعوت پر بلایا تھا جس میں بکری کے گوشت کی ثرید اور دودھ پیش کیا گیا۔ سب نے خوب سیر ہو کر کھایا اور پیا اور پھر بھی کھانا بچ رہا۔ یہ پورا واقعہ بنو عبد مناف کے دعوت دینے کا ہے جسے قوم قریش کا خطاب بنایا گیا ہے۔ (۱۷) شبلی ۲۱۰/۱-۲۱۱ نے معشر قریش کو کوہ صفا سے دعوت دینے کا واقعہ پہلے بیان کیا ہے اور بنو عبد المطلب

کو دعوت خاص دینے کا واقعہ بعد میں اور اسے کوہ صفا کے ''چند روز بعد کا'' واقعہ بتایا ہے۔ اس طرح وہ توقیت تاریخی کا مسئلہ ہے کہ رشتہ داروں کو دعوت پہلے دی گئی تھی یا قوم قریش سے خطاب پہلے کیا گیا تھا۔ کاندھلوی ۱/ ۲۷۱-۳۷۱ کئی آیات کریمہ نقل کر کے کوہ صفا سے خطبۂ نبوی کا مختصر ذکر بخاری سے کیا ہے۔ انھوں نے بھی شبلی کی مانند دعوت اسلام اور دعوت طعام کی سرخی کے تحت ''اولاد مطلب'' سے خطاب نبوی کو ابن اسحاق، بیہقی اور ابونعیم کے نام سے مگر سیوطی کی الخصائص الکبریٰ ۱/ ۱۲۳ سے نقل کیا ہے۔ ان کی بحث میں صرف ابولہب کی مخالفت کا ذکر ہے۔ وہ شبلی کے بیان کی ترتیب کے مطابق ہے اور چند مآخذ کا حوالہ صرف پیوند نقل ہے۔ دانا پوری، ۲۸، وسورہ انبیاء: ۹۸ ہے: اصل آیت کریمہ ہے: ''انکم وما تعبدون من دون اللّٰہ حصب جھنم'' معلوم نہیں کہ ''انتم'' کا اضافہ تسامح مولف ہے کہ حرکت کاتب۔ بہرحال مولف گرامی کی توقیت تعذیب بالکل صحیح نہیں ہے کہ امام بخاری اور مفسرین کرام کے مطابق سورہ انبیاء، بنواسرائیل، کہف اور مریم اور طٰہٰ یکے بعد دیگرے اتری تھیں اور موخر الذکر دونوں تو ہجرت حبشہ سے قبل کی ہیں۔ مریم کی تلاوت حضرت جعفر نے دربار نجاشی میں کی تھی اور حضرت عمرؓ کی اسلام لانے پر؛ بخاری/ فتح الباری ۸/ ۵۵۲ ومابعد؛ ابن کثیر تفسیر سورہ انبیاء۔ (۱۸) ابن اسحاق/ ابن ہشام ۱/ ۱۶۸-۱۷۰: ابن اسحاق اور ابن ہشام اور دوسرے کئی مآخذ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ بنوعبد مناف میں بنوامیہ اور بنونوفل نے بنوہاشم و بنومطلب کو چھوڑ دیا تھا اور مخالفت حق پر اتر آئے تھے لیکن یہ جزوی طور سے صحیح ہوسکتا ہے۔ بنوہاشم و بنومطلب نے یک جہت ہوکر آپؐ کی حمایت کی تھی اور دوسرے دونوں خاندان الگ رہے تاہم وہ مخالف نہیں بنے تھے جیسا کہ جوار مطعم سے معلوم ہوتا ہے۔ (۱۹) بلاذری ۱/ ۲۹۶-۳۶۰۔ اصل مفصل بحث میں بعض دوسرے اکابر کا بھی نام ہے اور ان کی مخالفت وعناد کی نوعیت کا بھی ان میں شامل ہیں: ہبیرہ بن وہب مخزومی، رکانہ بن عبد یزید مطلبی، مالک بن الطلاطلہ، حارث بن عامر نوفلی، طعیمہ بن عدی نوفلی، زہیر بن ابی امیہ، عبداللہ بن ابی امیہ۔ ابن سعد ۱/ ۹۶-۹۷؛ محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المحبر، ۱۵۷-۱۶۱۔ (۲۰) ابن اسحاق/ ابن ہشام ۱/ ۱۷۱ اور دوسرے صفحات؛ ابن سعد ۱/ ۹۸ ومابعد؛ بلاذری ۱/ ۳۰۰-۳۰۳؛ بخاری حدیث: ۳۸۵۴/ فتح الباری ۷/ ۲۰۷، ۱۷۰ وغیرہ۔ (۲۱) بخاری، فتح الباری ۷/ ۲۰۸ احادیث بخاری ۳۸۵۴ - ۳۸۵۶ مع اطراف کثیرہ۔ جن اکابر قریش کی تحریک وتعذیب نبوی کے باب میں نام گنائے ہیں وہ تھے: ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف یا اس کا بھائی ابی بن خلف خاص ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے تھے۔ بحث حافظ میں دوسرے اکابر کی کرتوتوں کا ذکر

بھی ہے۔ عام حمایت ابوطالب اور بنوہاشم و بنومطلب کی خاندانی مدافعت کے باوجود رسول اکرمؐ کی حفاظت کے لیے ان دونوں خاندانوں اور ان کے اکابر خاص کر ابوطالب کا محافظت نبوی کے لیے آگے آنا خاصا پریشان اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔ (۲۲) ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۱۷۸: "ثم ان قریشا تذا مروا بینهم علی من فی القبائل منهم من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم الذین اسلموا معه ؛ فوثبت کل قبیلة علی من فیهم من المسلمین" الخ؛ بلاذری ۱/۱۶۰ و مابعد؛ ۱/۴۳۹-۴۴۰ میں حضرت لبیبہ بنوالمومل کی جاریہ کو حضرت عمرؓ اسلام لانے سے قبل مار مار کر بیہوش کر دیتے تھے اور پھر حضرت زنیرہؓ پر عذاب ڈھاتے تھے۔ حدیث بخاری: ۳۸۶۲ میں حضرت سعید بن زید عدوی کے رسی سے باندھنے کا ذکر ہے "وان عمر لموثقی علی الاسلام قبل ان یسلم" ۔ حضرات ابوبکرؓ و طلحہؓ دونوں خاندان بنوتیم کے تھے جو خاصا کمزور بطن قریش تھا اور اپنے مسلموں کی مدافعت نہیں کر سکتا تھا۔ ابن العدویہ اسدی خاندان کا تھا اور دونوں صحابہ کو سزا دیتا تھا اور بنوتیم کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ ان دونوں صحابہ کرام کو ایک رسی میں باندھنے کے سبب القرینین (رفیق و شریک) بھی کہا جاتا کہ دور مظالم میں کرب و بلا کے ساتھی تھے۔ (۲۳) بلاذری ۱/ ۴۱۸ و مابعد: حضرت بلالؓ کو امیہ بن خلف سزا دینے کے لیے گلے میں رسی باندھ دیتا اور بچوں کو حکم دیتا کہ ان کو گھسیٹتے پھریں: "ویضع امیة فی عنقه حبلا ویامرون الصبیان فیجرونه" نیز ۱/۴۱۹، ۴۳۸۔ حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدویؓ پر مظالم کرنے والے رشتہ داروں نے اسی طرح اوباشوں اور شریروں کو استعمال کیا تھا: ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۱۵۲: "ووکل به الخطاب شبابا من شباب قریش وسفهاء من سفهائها" ۔ (۲۴) ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۲۰۱ و مابعد؛ بلاذری ۱/۴۴۱ وغیرہ؛ بخاری/فتح الباری ۷/ ۲۰۷ و مابعد: باب ما لقی النبیؐ واصحابه من المشرکین بمکة ۔ (۲۵) ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/ ۱۸۶ و مابعد: ابوسفیان بن حرب اموی کے کسی ظلم و ستم کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف مآخذ میں ان کے حسن سلوک کے متعدد واقعات ملتے ہیں جو مکی دور اور مدنی دور دونوں سے متعلق ہیں؛ بلاذری ۱/۳۲۵ و مابعد۔ (۲۶) ابن اسحاق ۱/۱۷۹، ۱۸۵-۱۸۶ و مابعد نے عتبہ بن ربیعہ کے خطاب قریش کے چند جملے بھی نقل کیے ہیں: "یا معشر قریش ! اطیعونی واجعلوها بی ، وخلوا بین هذا الرجل وبین ما هو فیه ، فاعتزلوه ، فوالله لیکونن لقوله الذی سمعت منه نبأ عظیم ، فان تصبه العرب فقد کفیتموه بغیرکم ، وان یظهر علی العرب فملکه ملککم ، وعزه عزکم ، وکنتم اسعد الناس به" ،

قال : هذا الی فیه ، فاصنعوا ما بدالکم" ۔اس کی اسناد منقطع ہے لیکن امام حاکم نے صحیح سند سے اسے روایت کیا ہے ۔ (۲۷) بلاذری ۱/۱۳۴۱ و مابعد؛ ابن اسحاق/ابن ہشام ،طبری وغیرہ مذکورہ بالا۔ دوسرے واقعات ملاطفت و مدارات میں ان اکابر کے منصفانہ رویے اور معتدل ردعمل کی تفصیلات آگے آتی ہیں ۔ (۲۸) بخاری/فتح الباری ۷/۲۳۵-۲۴۰ و مابعد؛ بلاذری ۱/۲۴۲-۲۴۵ نیز فہرست مہاجرین حبشہ۔ ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۲۰۴:"وانه لا یقدر علی ان یمنعهم مما هم فیه من البلاء" عام طور سے سیرت نگاروں نے اس بے بسی کی نسبت رسول اکرمؐ کی طرف کی ہے ۔سیرت ابن اسحاق اردو ترجمہ نور الٰہی ایڈووکیٹ ،نقوش رسول نمبر ۱۹۸۵ء، ۱۱/۱۹۱ میں رقت عمری کا ذکر ہے ۔ (۲۹) بلاذری ۱/۳۲۵ و مابعد؛ بخاری/فتح الباری ۴/ ۶۰۴-۶۰۵: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ کی حدیث بخاری: ۲۳۰۱ میں یہ بیان ہے:"کاتبت امیة بن خلف کتابا بان یحفظنی فی صاغیتی بمکة واحفظه فی صاغیته بالمدینة" اسے تقریر نبوی بھی حاصل تھی ، بحث کے لیے کتاب خاکسار ،مکی اسوہ نبوی ......کراچی طباعت ، ۱۷۸ و مابعد؛ نیز فتح الباری ، بحث حافظ ابن حجرؒ ۔طبری ۲/ ۴۵۱ میں حضرت عبدالرحمٰنؓ کا ایک اور بیان ہے کہ مکہ میں امیہ بن خلف میرا دوست تھا: کان امیة بن خلف لی صدیقا بمکة ؛ بلاذری ،قاہرہ طباعت ۱/۱۹۱۔ (۳۰) ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/ ۲۱۴ نے عبداللہ بن ابی ربیعہ کا جملہ نقل کیا ہے:"لا تفعل فان لهم ارحاما ، وان کانوا قد خالفونا" حضرت عمرو بن العاص سہمی دراصل مسلم مہاجرین کے حضرت عیسیٰ کے بارے میں عقیدہ کو حربۂ سفارت بنانا چاہتے تھے ۔ بلاذری ۱/۳۲۵-۳۲۶؛ طبری ۲/۴۵۱:"کان امیة بن خلف لی صدیقا بمکة" مآخذ سیرت کے بیانات کی تصدیق بخاری وغیرہ سے بھی ہوتی ہے ۔بخاری/فتح الباری ، کتاب الوکالہ ، باب اذا وکل المسلم حربیا الخ ،۴/۶۰۴-۶۰۵ نیز مکی اسوہ نبوی ۱۷۸ ،صحیفہ مقاطعہ کے حوالے سے ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔

فنِ تاریخ گوئی میں علمائے باقیات کا حصہ

ڈاکٹر راہؔی فدائی

(۲)

علامہ امانؔی ایک قلیل مدت کے لیے پدوکوڈی (تمل ناڈو) میں قیام فرما تھے، جہاں مدرسہ کی تاسیس اور کتب خانے کی تعمیر کے بہترین وخوبصورت تاریخی قطعے عربی اور اردو میں کہے جو اہل نظر کے لیے سرمۂ بصیرت سے کم نہیں ہیں۔

تاریخ افتتاح مدرسۂ انوار المحمدی المسمیٰ بمدرسۂ نور محمد، الواقعہ بغدوکدی

شد بنا مدرسۂ علم رسول کامل آمد سرو سامانِ حدیث

از امانؔی سنِ آں پرسیدم گفت ''وہ گلشنِ عرفان حدیث''

(تیرہ سو چونتیس) ۱۳۳۴ھ

چشمہ ہے یہاں جاری اسرارِ محمدؐ کا یہ جامعہ اونچا ہے افلاک کے گنبد سے

تاریخ کہی اُس کی خوش ہوکے امانؔی نے ''یہ مدرسہ روشن ہے اسرار محمدؐ سے''

(تیرہ سو چونتیس) ۱۳۳۴ھ

کتب خانۂ محمدیہ، پودوکوڈی ''لقد قامت دار الکتاب''

(تیرہ سو چونتیس) ۱۳۳۴ھ

بہت پسند کیا اہلِ علم نے اس کو خدا کے فضل سے یہ دافع کروب بنا

یہاں ہیں جمع امانؔی ہر ایک فن کے کتب سناؤ سال ''یہ دارالکتاب خوب بنا''

(تیرہ سو پینتیس) ۱۳۳۵ھ

نمبر ۲۱۔ تیسرا کراس، عثمان اسٹریٹ، خوش حال نگر، کے جی ہلی، بنگلور ۴۵۔

دَارَالْعُلُوْم بَنَتْ لَنَا اَیْدی فقیر محمدٍ عَبدِالکریم اَنَا رَھَا بَرَکَاتُہٗ اَحْیَیْتَنَا
طلاب علم بادروا اضحی اماتی قائما تَارِیْخُھَا "النوْرُ الْمُحَمَّدِیُ ضَاءَ بَیْنَنَا"
(تیرہ سو پینتیس) ۱۳۳۵ھ

علامہ اماؔنی باقوی کی تاریخ گوئی کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف میں تأمل نہ ہوگا کہ انہوں نے اس فن شریف کی ترقی و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، ملک کے جنوب بعید کا وہ علاقہ جو انگریزوں کے دور اقتدار میں صوبہ کرناٹک کہلاتا تھا، بعد کو "تمل ناڈو" کے نام سے موسوم ہوگیا اور جہاں اردو زبان بالعموم بولی اور سمجھی نہیں جاتی تھی، اس لق ودق صحرا میں علامہ اماؔنی نے نہ صرف اردو شعر و ادب کی چمن بندی و آبیاری کی بلکہ تاریخ گوئی جیسے مشکل ہنر کو اس قدر عام کردیا کہ اصحاب علم و فضل عربی اور فارسی ہی میں نہیں، اردو میں بھی تاریخی قطعے لکھنے کو باعث فخر سمجھنے لگے۔ یہ کمال ان کی سرپرستی میں ان کے تلامذہ جیسے حضرت کماؔلی ویلوری، حضرت تاؔج ترچناپلوی، حضرت افسؔر کڈپوی، حضرت حاؔمد الباقوی، حضرت فدوؔی باقوی وغیرہم میں منتقل ہوگیا، (مذکورہ بالا اکابر ادب کے متعلق مزید تفصیلات کے لئے راقم الحروف کی تصنیف "مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے علمی و ادبی کارنامے"، مطبوعہ ۱۹۹۶ء مطالعہ فرمائیں)

مذکورہ دلائل و شواہد کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علامہ اماؔنی کی علمی و ادبی خدمات کے اثرات و ثمرات ناقابل فراموش اور ابداً لآباد تک انشاء اللہ جاری و ساری رہیں گے۔

حضرت علامہ ندوؔی باقویؒ: حضرت علامہ ابوالکمال حبیب اللہ باقوی ندوی (ولادت ۱۳۰۴ھ وفات ۱۳۹۱ھ) کے والد ماجد حضرت علامہ ابوالجلال محمد غلام محی الدین باقوی (متوفی ۱۳۲۲ھ) مدرس مدرسۂ باقیات صالحات، اعلیٰ حضرت بانی مدرسہ کے برادر زادے اور دست راست تھے۔ حضرت ندوؔی تخلص کے اعتبار ہی سے ندوی نہ تھے بلکہ انہوں نے مدرسۂ باقیات سے فراغت کے بعد لکھنو جاکر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور وہاں سے عربی ادب کی تکمیل کی، اسی لیے باقوی ندوی کا لاحقہ استعمال کرتے تھے، جب ندوہ سے فارغ ہوگئے تو مدرسہ فرنگی محل لکھنو میں مدرس کی حیثیت سے اپنی تدریسی مصروفیات کا آغاز فرمایا اور وہیں اپنے دو رسالوں کی تسوید مکمل کی جیسا کہ خود تحریر کیا ہے:

''بعون خلاق زمین وزماں، صناع مکین ومکاں، تذکرۂ ابوالجلال و ترجمہ ابوالکمال خاکسار کو حسبِ خاطر خواہ دونوں رسالوں سے روز یکشنبہ بتاریخ ۲۰/ ماہ جنوری مطابق ۱۹۲۴ء بہ مقام شہر لکھنؤ فراغت حاصل ہوئی''۔ (تذکرۂ ابوالجلال، خاتمہ، ص:۵۲ مطبوعہ ۱۳۴۵ھ مطبع علوی آمبور)

ندوۃ العلماء میں تعلیم کے باوجود وہاں کے رائج مسلک سے ہمیشہ دور رہے۔ اصل رجحان بریلویت کی طرف تھا، اس کے باوجود ان کے تبحر علمی کا ایک زمانہ معترف تھا، فصیح و بلیغ مقرر، صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ شاعری میں طرز قدیم کے پیروکار تھے، مدرسہ فرنگی محل، لکھنؤ کے علاوہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ، کرنول (آندھرا) مدرسہ مظہر العلوم، آمبور (تمل ناڈو) مدرسۂ قوۃ الاسلام، بنگلور (کرناٹک) میں تدریسی خدمات انجام دیں، آخر میں مدرسہ حقانیہ، بنگلور میں صدر مدرس و مفتی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہ کر ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۹۷۰ء میں اپنی جان جاں آفریں کے حوالے کردی، ان کے خلف صالح علامہ ندوی باقوی (متوفی ۱۴۱۴ھ) نے ''ازسرِ ما برفت ظل پدر'' جیسے عمدہ وشستہ مصرعے کے حروف منقوطہ سے سال رحلت برآمد کیا تھا۔

نثری رسائل میں ''تذکرۂ ابوالجلال'' تقریظ الوکیل، القول الفیصل، گلدستۂ توحید اربعہ' کے علاوہ ایک ضخیم کتاب ''تحفۃ الحج'' (مطبوعہ ۱۳۶۶ھ) اور دفتر فتاویٰ ان کی یادگار ہیں، بعض منظومات ''گلزار ندوی'' حصہ اول ودوم کے نام سے زیور طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ فنِ تاریخ گوئی میں عبور حاصل تھا، 'تحفۃ الحج' کا تاریخی نام ''کتاب ذکر پاک'' رکھا تھا جس سے کتاب کی طباعت کا سال ۱۳۶۶ھ کا اشارہ ملتا ہے۔ مزید براں اپنے فرزند علامہ نثار احمد فدوی باقوی کی ولادت پر ایک بے مثال تاریخی قطعہ بزبان فارسی کہا تھا جس میں ایک مصرعے سے سن ہجری اور سن عیسوی دونوں برآمد ہوتے ہیں۔

مرحبا اھلاً و سہلاً مرحبا یا للفرح شد زرحمت چشم ما رون دلِ ما شاد شاد
''اخترِ قوم'' و ''چراغ خاندان آبادی'' است ندویا نورٌ علیٰ نور سنش آباد باد

(تیرہ سوسینتالیس) ۱۳۴۷ھ (انیس سو اٹھائیس) ۱۹۲۸ء

اردو میں بھی خوبصورت قطعۂ تاریخ کہا ہے۔

بحمدللہ زہے قسمت ہوا پیدا　　مبارک نیک فرزندِ حسیں فی الحال
کہا زیبا ہے ندوی ازروئے تقویم　　سن مولود ''ہے فرزندِ فرّخ فال''
(تیرہ سوسنتالیس) ۱۳۴۷ھ

علاوہ ازیں ''نثار احمد پسر یادگار آمد'' (۱۳۴۷ھ) کے فارسی مصرعے سے سن ہجری اور ''جاں فزا نور نظر دل کا پیارا نکلا'' کے اردو مصرعے سے سن عیسوی ۱۹۲۸ء کا استخراج کیا ہے۔

اپنے والد ماجد حضرت ابوالجلال مولانا محمد غلام محی الدین قادری کے انتقال پر درج ذیل قطعہ تاریخ کہا تھا جس سے عیسوی سال ۱۹۰۳ء نمایاں ہوتا ہے۔

آہ مولانا غلام محیِ دینِ بوالجلال　　آں مدرس صدرِ بدرِ باقیات صالحات
اولِ ماہِ صفر بود صبحِ دوشنبہ بداں　　یافت از دار فنا سوئے بقا راہِ نجات
درسنش کردم تأمل ، ندویا ہاتف بگفت　　''داخل خلدِ بریں شدوائے آں'' سالِ وفات
(انیس سوتین) ۱۹۰۳ء

اپنے برادر عزیز حضرت مولانا ابوالجمال عبدالحئی قادری مدرس مدرسہ باقیات کی وفات ۱۳۲۹ھ پر عربی اور اردو میں تاریخی قطعے کہے ہیں۔

حضرتِ مرحوم مولانا محمد عبد حی　　آہ ان کے ہجر میں ہیں کُل پریشاں آہ آج
مجھ سے ملہم نے کہا بے یاد ندوی سالِ رفت　　''مَوْتُ عَالِمٍ ثلمةٌ فی الدین حق واللہ آج''
۱۵　　(انیس سو گیارہ) ۱۹۱۱ء = ۱۵۔۱۹۲۶

عربی قطعہ کا آخری شعر اس طرح رقم کیا ہے۔

قُلْ اِرْخَہٗ نَدْوِیُ بِدُعَاءٍ وَخُلُوْصٍ　　"ابـداً رَضِـيَ الـلّٰهُ بِهٖ عَنْكَ وِصَالًا"
(تیرہ سوانتیس) ۱۳۲۹ھ

مذکورۂ بالا شعر کے مصرع ثانی میں لفظ اللہ کے ایک لام کا اخراج کس طور پر کیا ہے، احقر سمجھ نہیں سکا ہے۔

حضرت کمالؔی ویلوریؒ: حضرت مولانا صوفی عبدالسلام کمالؔی باقوی (ولادت ۱۳۲۴ھ وفات ۱۴۱۵ھ) کے والد ماجد حضرت مولانا صوفی خطیب عبدالرزاق صاحب حضرت قطب ویلور

قدس سرہ (۱۲۰۷ھ۔۱۲۸۹ھ) کے خلیفہ خاص تھے۔انہوں نے نور نظر کمآلی کو اپنے پیر بھائی اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب قادری (متوفی ۱۳۳۷ھ) کے مدرسہ باقیات صالحات میں داخل فرمادیا جہاں سے ۱۹۴۵ء میں حضرت کمآلی کی فراغت ہوئی ۔حضرت کمآلی نے ۱۹۳۶ء میں مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان دیا جس میں اعلیٰ درجے میں کامیاب قرار دیے گئے ۔اس کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۳۷ء میں ارکونم (تمل ناڈو) کے مشن اسکول میں اردو کے استاذ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا۔ جب ہائی اسکول سے وظیفہ یاب ہوگئے تو خوش قسمتی سے ان کو مدرسۂ باقیات ہی میں خدمت تدریس کا موقع میسر آیا۔ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۷۰ء میں مدرسہ سے علاحدگی اختیار کرلی۔ بعدازاں حضرت علامہ ابوالسعود احمد باقوی (متوفی ۱۴۱۷ھ) نے اپنی درسگاہ دارالعلوم سبیل الرشاد (۱۹۶۰ء) کے لیے بحیثیت صدر شعبۂ فارسی ان کا انتخاب فرمایا۔حضرت کمآلی نے بڑی عمدگی اور دلجمعی کے ساتھ فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد جسمانی ضعف اور ناسازیٔ طبیعت کی بناپر سبیل الرشاد سے علاحدگی اختیار کرلی اور اسی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

حضرت کمآلی علامہ امآنی کے شاگرد رشید تھے ،شعر وسخن کے رموز و لطائف استاذ محترم سے سیکھے۔جس کی وجہ سے ان کی شاعری اعلیٰ فنی معیار کی حامل اور اہل زبان کے لیے رشک کے قابل ہوگئی۔وہ ایک قادرالکلام شاعر تھے، بدیہہ گوئی میں ان کا جواب نہیں۔خصوصاً فن تاریخ گوئی میں یدطولیٰ حاصل تھا،احباب کے اصرار پر کئی طرح کی تاریخیں کہی تھیں۔جن میں سلاست وروانی کے علاوہ فنی حسن بھی ہے۔

علامہ اشرف سعودی باقوی نے فارسی درسیات کی ابتدائی کتب ''چہل سبق''، ''آراستن''، ''گفتگو نامہ''، ''حکایات لطیف'' وغیرہ کو عمدہ تسہیل اور حسن ترتیب سے آراستہ کرکے خوبصورت کتابت اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ''المصاحف'' بنگلور سے شائع کیا ہے، حضرت کمآلی نے مذکورہ کتابوں کی ترتیب نو کے موقع پر کارآمد و بامعنی تاریخیں کہی ہیں جنہیں ہدیہ ناظرین کیا جارہا ہے۔

قطعہ تاریخ ''چہل سبق'' نو ترتیب:

قواعد اچھے ، مطالب ہیں روشن ورنگیں ہے نسخہ معتبر ودلکشا وخوش آئیں

ہے پاک حشو زوائد سے مثلِ آئینہ نہ جائے چوں و چرا، موقعِ چناں وچنیں
مفید عام کمآلی خدا کرے اس کو ''خوشا چہل سبقِ طرزِ نو ہے'' سالِ حسین
(تیرہ سو چورانوے) ۱۳۹۴ھ

قطعہ تاریخ ''آراستن'':

فاضل مرتب قابلِ تحسین عزیزِ محترم اشرؔف سعودی باقوی اہل کمال وخوش سخن
اب تو کمآلی طالبوں کا راستہ ہموار ہے کہہ طبع کا سالِ رواں ''بس خوبیٔ آراستن''
(تیرہ سو ترانوے) ۱۳۹۳ھ

تاریخ گفتگو نامہ نو ترتیب:

جنابِ اشرؔف سعودی عقدہ ہارا چو حل کردہ براہِ کامیابی
کمآلی گفت سالِ طبعِ نورس ''مہذب گفتگو نامہ بیابی''
(تیرہ سو چورانوے) ۱۳۹۴ھ

تاریخ حکایات لطیف:

عزیزِ محترم اشرف سعودی بہ تحقیق آبِ معنی چوں گہر بست
سنِ ترتیب نو گفتہ کمآلی ''گل نورس حکایات لطیف است''
(تیرہ سو چھیانوے) ۱۳۹۶ھ

علامہ اشرف سعودی باقوی کے خسر محترم الحاج وی پی عبدالمالک صاحب ایک صاحب کردار و نیک اطوار شخص تھے، ان کی وفات پر حضرت کمآلی نے قطعہ تاریخ کہا ہے۔

رحلت بتاریخ ۲۱ رمحرم ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۴ر جنوری ۱۹۷۷ء

مجسم خُلق ، مخلص ، نرم گفتار مروّت کیش ،حق بیں، مرد سالک
کہا ہاتف نے سالِ غم کمآلی ''ریاض خلد میں ہیں عبد مالک''
(تیرہ سوستانوے) ۱۳۹۷ھ

علامہ فدوی باقویؒ: علامہ ابوالافتخار الیس کے نثار احمد فدوی باقوی (ولادت ۱۳۴۷ھ وفات ۱۴۱۴ھ) خانوادۂ شاہ مدار علیہ الرحمہ کے چشم و چراغ تھے، ''ایں خانہ تمام آفتاب است''

کے مصداق ان کے اسلاف میں کثرت سے علماء وصلحاء گزرے، والد بزرگوار مولانا شاہ ابوالکمال باقوی ندوی، دادا مولانا قاری شاہ غلام محی الدین (ثانی)، پردادا مولانا شاہ شرف الدین، اسی ترتیب سے مولانا حافظ قاری عبدالقادر آتوری (ثانی)، مولانا شاہ غلام محی الدین (اول)، مولانا حافظ شاہ عبدالقادر مدورائی، حضرت شاہ مدار اوران کے والد حضرت شاہ شمس الدین عربی وغیرہ قدس اللہ اسرارہم اہل اللہ میں سے تھے۔ جد امجد شاہ غلام محی الدین (ثانی) اعلیٰ حضرت بانیٔ باقیات صالحات، ویلور کے برادرزادے تھے۔ علامہ فدوی نے اپنے والد ابوالکمال ندوی (متوفی ۱۳۹۱ھ) کے علاوہ مدرسہ باقیات کے ماہر اساتذۂ کرام کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا، خصوصاً حضرت علامہ امانی باقوی ادب میں ان کے مقتدیٰ تھے۔ ان سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع تو نہیں ملا مگر وقتاً فوقتاً استفادے کی صورت نکال لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی محنت وریاضت، طبعی ذوق وشوق اور خداداد ذکاوت وفراست اور غیر معمولی قوتِ اکتساب وانجذاب سے فن شاعری میں ملکہ حاصل کیا اور استاذ سخن کہلائے۔ بقول علامہ فیضی صدیقی (متوفی ۱۴۳۱ھ):

> ''اگر میں یہ دعویٰ کروں تو بیجا نہ ہوگا کہ آج جنوبی ہند میں آپ کی ٹکر کا کوئی اور ادیب نہیں ہے۔ اس فن میں آپ کو استاذی کا درجہ حاصل ہے''۔
>
> (باقیات ایک جہاں، ص: ۱۶۷، مطبوعہ ۱۹۸۰ء)

راقم الحروف کی نظر میں علامہ فدوی باقوی کے مقابلہ کا کوئی استاذ سخن جنوب کیا شمال میں بھی ملنا مشکل ہے۔ یہ اس لیے کہ ان کو اردو، فارسی ادبیات کے ساتھ تمل، ملیالم زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا، وسعت مطالعہ کا یہ عالم کہ کسی بھی لفظ کی تحقیق ان سے کی جائے تو اس کی اصل، اس کی تذکیر وتانیث اور اس کے صحیح تلفظ کے ثبوت میں اساتذہ کے بیسیوں شعر فوراً پیش کردیتے، جس سے سائل مطمئن ہوجاتا، علاوہ ازیں متقدمین اساتذہ کے دواوین ان کی نوکِ زبان پر رہتے اور محاسن ومعائب سخن پر گہری نظر رہتی، شاعری کے رموز وحقائق کے واقف اسرار تھے۔ بالخصوص علم عروض پر مجتہدانہ تصرف حاصل تھا، اردو اور فارسی کے محاورات وضرب الامثال ازبر تھے۔ اس زبان دانی سے اہل زبان انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔

ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) نے اپنی

ڈیڑھ سو سالہ (۱۵۰) زندگی میں ہزاروں علما وفضلا اور ادبا وشعرا کو جنم دیا جن کی ایک بڑی تعداد گمنام ہے، تاہم ادبا وشعرا کی خاصی تعداد ایسی ہے جن کے نام روشن حروف میں مرتسم ہیں، راقم کی رائے میں ان میں تین ایسی شخصیتیں ہیں جن کی ضیا پاشی سے ہندوستان کا ادبی منظر نامہ تابناک ہوا اور وہ ہیں۔ (۱) مولانا گنڈ وعبدالقادر شاکر وانم باڑی۔ (۲) علامہ ضیاء الدین احمد امانیؔ باقوی۔ (۳) مولانا نثار احمد فدویؔ باقوی (رحمہم اللہ)۔

سیرت طیبہؐ پر مشتمل صد ہار باعیات جناب فدوی کے فنی کمال اور فکر وخیال کی گواہی دینے کے لیے کافی ہیں، چند رباعیات پیش ہیں:

یوں بندوں پہ فضل کبریا ہوتا ہے مکے سے رواں بحرِ صفا ہوتا ہے
جس شمع سے ہونے کو ہے عالم روشن اس شمع سے تابندہ حرا ہوتا ہے

وہ تابشِ چشم جس پہ قرباں صد طور وہ طرز تکلّم کہ ملائک مسحور
کرتا ہوں ثنا کہ پڑھ رہا ہوں قرآں وہ گیسوئے والیل وہ روئے والنور

محبوبؐ خدا صاحبِ اسرار تم ہو سربستہ رموز حق کے دانا تم ہو
بچھتا ہے تمہارے ہی لیے عرش کا فرش واللہ کہ کونین کے آقا تم ہو

دنیا کو ملا ان سے مساوات کا درس اخلاق کا پاکیزہ خیالات کا درس
اللہ رے اعجازِ حدیثِ قدسی ہر بات کی تعلیم ہے ہر بات کا درس

عمدہ غزلیں اور اثر انگیز نظمیں بھی ہیں، مگر افسوس ہے کہ مجموعہ کلام اب تک منظر عام پر نہیں آسکا۔ نثری کاوشوں میں بجز ''مجدد جنوب'' (مطبوعہ ۱۹۷۴ء) کے ''حاصل مطالعہ''، ''سیارگاں جنوب'' اور ''نگاہ بدبیں'' ہنوز اشاعت کی منتظر ہیں۔

فن تاریخ گوئی میں بھی قدرت ومہارت تامہ حاصل تھی، انہوں مختلف موقعوں پر تاریخیں موزوں کیں۔

اپنے والد حضرت ندویؔ کی وفات پر تاریخ ''از سرما برفت ظلِ پدر'' ۱۳۹۱ھ (تیرہ سو اکانوے) کہی تھی۔

اپنے برادر خرد کی ناگہانی وفات پر ''رحلت برادر ہر دل عزیز'' سے ہجری تاریخ (تیرہ

سواٹھتر)۱۳۷۸ھ اور ''داغِ جواں نورالحسن ممتاز'' سے عیسوی تاریخ (انیس سواٹھاون) ۱۹۵۸ء کا استخراج کیا۔

اپنی شادی کی خوبصورت تاریخ بھی نکالی۔

ہر سانس پیامِ شادمانی ہے آج ہرگام نوید کامرانی ہے آج
برجستہ یہ اپنے عقد کی ہے تاریخ ''آغاز بہارِ زندگانی ہے آج''
(تیرہ سو اٹھتر) ۱۳۷۸ ھ

(مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے علمی وادبی کارنامے، ص۱۴۰، مطبوعہ ۱۹۹۶ء)

علامہ فیضی صدیقیؒ نے تاریخ گوئی میں ان کی مہارت کا ایک واقعہ اپنی کتاب ''حرف و حکایت'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

''لگے ہاتھ فدوی سلمہ (حضرت فیضی کے رشتہ دار خواہر زادے) نے ایک اور واقعہ سنایا جو ان کی ذات سے وابستہ ہے اور جس سے تاریخ گوئی میں ان کی مہارت ظاہر ہوتی ہے، کہا کہ ایک مرتبہ جب وہ ترور (ملیبار) میں رہتے تھے تو ان کے ایک دوست عبدالرشید نامی کے یہاں لڑکی تولد ہوئی چونکہ یہ ان کی اولین اولاد تھی، وہ اچانک آئے اور فدوی سلمہ کو مع چند اور احباب کے اپنے گھر لے گئے، احباب چونکہ لاعلم تھے، پوچھا یہ کس خوشی میں؟ کہا کہ میری لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ احباب نے کہا مٹھائی کھلانی ہوگی۔ کہا کہ ضرور کھلائی جائے گی۔ مگر میری بھی عرض ہے، پھر فدوی سلمہ سے کہا کہ آپ کو اس کا نام رکھنا ہوگا اور وہ بھی تاریخی نام ہو۔ پس فدوی سلمہ پر چودہ طبق روشن ہوگئے، کہا کہ بھئی! یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اٹھے بیٹھے کہدی جائے، اس کے لیے کاغذ قلم اور وقت درکار ہے۔ اس دوست کو ان کی ذکاوت پر اتنا بھروسہ تھا کہ فوراً کاغذ قلم حاضر کردیا، کہا کہ آپ کے لیے وہ کونسی بڑی بات ہے حضرت! چونکہ فوراً نام پیش کرنا تھا لہٰذا آپ شش و پنج میں پڑ گئے۔ مگر بفضلہٖ تعالیٰ اس فن میں ان کی مہارت کام دے گئی، اس وقت ہجری سال ۱۳۶۶ھ تھا، چند لمحات کے تفکر سے ذہن کی گہرائیوں

میں ایک نام ابھر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کاغذ پر لکھ دیا ''نسیمہ اختر'' (تیرہ سو چھیاسٹھ) ۶۶ھ۱۳ (''حرف وحکایت''، ص ۱۸، مطبوعہ ۲۰۰۹ء)

ایک اور واقعہ ہے:

ملک کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم سبیل الرشاد میں حضرت علامہ ضیاء الدین احمد امانی باقوی کی رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ بتاریخ ۶؍رجب المرجب ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹؍اکتوبر ۱۹۶۶ء بروز جمعہ منعقد ہوا تھا جس میں شوقؔ بنگلوری، ڈاکٹر حکیم عبدالمنتقم خان دانشؔ، حضرت ابوالکلام شاد زیبائی، حضرت مولانا تاجؔ ترچناپلوی، حضرت مولانا نیر ربانی، حضرت مولانا مفتی اشرف سعودی باقوی وغیرہ اہل نظر واصحاب ہنر تشریف فرما تھے۔ اس مجلس میں قلم کار شرکاء نے اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی صواب دید کے مطابق تاریخیں کہیں، مگر حسن اتفاق دیکھئے کہ حضرت تاجؔ اور حضرت فدویؔ کے مادہ ہائے تاریخ توارد کا شکار ہوگئے، مذکورہ دونوں حضرات نے بالترتیب ''شیخ ملت آہ'' اور ''آہ شیخ ملت'' سے سال وفات ۱۳۸۶ھ برآمد کیا تھا۔ حضرت تاجؔ باقوی نے حضرت فدویؔ سے پہلے اپنا کلام اور مذکورہ مادۂ تاریخ بیان کر دیا تھا، جب حضرت فدوی کی باری آئی تو انہوں نے اپنی ''آہ شیخ ملت'' (۸۶ھ۱۳) سے ہجری تاریخ سن ایک ہزار تین سو چھیاسی بیان کر دیا۔ لیکن اپنے لیے تخصیص کی یہ صورت نکالی کہ اسی مادۂ تاریخ کے ساتھ ''علامۂ روزگار'' کا لاحقہ بڑھا کر ''آہ شیخ ملت علامہ روزگار'' سے مطلوبہ عیسوی تاریخ ۱۹۶۶ء کا برمحل اور برموقع اخراج کیا۔ (سالنامہ نفیر ویلور۔ شمارہ ۱، ص ۴۳، مطبوعہ ۱۹۸۸ء) یہاں ایک اور دلچسپ واقعہ کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ وہ ایک دن دوپہر کے وقت دواخانے سے آرہے تھے، گلی کے نکڑ پر اچانک دوست جناب بدر جمالی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ دوست نے علیک سلیک کے بعد پوچھا کہ اس وقت آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں، جواب دیا 'نرسنگ ہوم سے آرہا ہوں، ہمارے ہاں لڑکا ہوا ہے'۔ یہ سن کر بدر جمالی نے نومولود کا نام دریافت کیا، بتلایا ''افتخار احمد''۔ اس پر موصوف کی رگ شرارت پھڑک اٹھی، کہا شاید تاریخی نام ہوگا، حالانکہ بدر جمالی خوب جانتے تھے کہ معاملہ ایسا نہیں ہے، علامہ فدوی نے اس طنزیہ لہجے کو محسوس کرتے ہوئے برجستہ کہا ''افتخار فدوی'' کہہ لیں جس سے سن ولادت ۱۳۸۲ء برآمد ہوتا ہے۔

حضرت علامہ اشرؔف سعودی: علامہ حافظ محمد اشرف علی باقوی المتخلص بہ اشرؔف سعودی (ولادت ۱۹۴۰ء) کی تعلیم کا آغاز والد ماجد حضرت علامہ حافظ شاہ ابوالسعو د احمد باقوی (متوفی ۱۹۹۶ء) کے زیرسرپرستی اور تکمیل اہتمام مدرسۂ باقیات صالحات، ویلور کے اساتذہ کرام کی نگرانی میں ہوا۔ مزید ۱۳۸۱ھ میں دیوبند کا قصد کیا۔ وہاں دو سال گزارے اور مختلف اساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ بعد ازاں وہ دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور میں شیخ الحدیث و مفتی شریعت کے منصب اعلیٰ پر فائز ہوئے۔ والد بزرگوار کے انتقال ۱۴۱۶ھ کے بعد مدرسہ کے اہتمام اور صوبہ کرناٹک کی امارت شرعیہ کی ذمہ داری بھی سپرد کردی گئی جسے وہ بہ حسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔

وہ نصف صدی سے حدیث شریف کی خدمت عالیہ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ پچاس (۵۰) سال سے درس بخاری کا اہتمام ایک غیر معمولی امتیازی کارنامہ ہونے کے علاوہ ان کے اسم بامسمیٰ ہونے کی بھی بین دلیل ہے۔ "ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء" راقم الحروف کی رائے میں یہ نعمت عظمیٰ ان کی اس لیے میسر آئی ہے کہ اپنے اساتذہ مثلاً حضرت شیخ التفسیر سید شاہ عبدالجبار صاحب قادری باقوی، حضرت علامہ محمد جعفر حسین صاحب باقوی فیضی صدیقی، حضرت مولانا الحاج رئیس الاسلام صاحب باقوی، حضرت مولانا فدوی باقوی، حضرت مولانا کمالی ویلوری باقوی، حضرت مولانا شیخ الحدیث سید فخرالدین صاحب قاسمی، حضرت علامہ فخرالحسن صاحب قاسمی، حضرت شیخ الفقیہ مولانا مفتی مہدی حسن صاحب قاسمی وغیرہم (قدس اللہ اسرارہم) سے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی بلکہ ان کی ہر مجلس اور ہر محفل مذکورہ اساتذۂ کرام کے تذکرہ سے ہمیشہ معطر و معنبر رہتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان میں بہت سی خوبیاں ودیعت کی ہیں۔ وہ بیک وقت بلند پایہ محدث ومفسر، مایہ ناز مفتی وفقیہ، دردمند مصلح وخطیب ہونے کے علاوہ سخنور وشاعر اور مقتدر ادیب وانشا پرداز بھی ہیں۔ اسی لیے ان سے استفادہ کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، ان میں عالم و خطیب بھی ہیں اور شاعر وادیب بھی۔ ان سب کے حق میں ان کا فیضان علمی شب وروز جاری رہتا ہے۔

ہمارے ملک کے طول وعرض میں فن تاریخ گوئی کے ماہرین کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

ان میں بھی وہ کمال نظر نہیں آتا جو متقدمین شعرا و قلم کاروں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ تاہم اس دور کے تاریخ گو شعرا میں علامہ اشرف سعودی کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے، درحقیقت ان کو اس فن لطیف میں یدطولیٰ حاصل ہے، چونکہ وہ عربی، فارسی اور اردو زبان و ادب کے مزاج شناس و ماہر نباض ہیں، اس لیے ان کی کہی ہوئی تاریخوں میں وسعت فکری، بلند خیالی کے ساتھ شگفتگی و شائستگی بھی متوجہ و متاثر کرتی ہے۔ انہوں نے مختلف احوال و آثار کے ضمن میں بیسیوں عمدہ و تابندہ تاریخیں رقم کی ہیں جن میں سے چند ذوق طبع کی تسکین کے لیے اہل علم کی نذر کی جارہی ہیں۔

انہوں نے بہت سی فارسی درسیات اور عربی صرف و نحو کی کتابوں کو سلیقہ مند ترتیب سے آراستہ کیا، جس سے طالب علموں کی ذہن سازی و یاد دہانی میں بڑی سہولت ہوگئی ہے۔ اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے ''نحو میر'' کی نو ترتیب کے وقت درج ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے:

بحمداللہ نحوِ میرِ آساں مزید آساں شدہ از فضلِ رحماں
سنِ ترتیبِ نو اشرفؔ بگفتا ''مرتب نسقِ نحوِ میرِ جرجاں''
(چودہ سوتیئس) ۱۴۲۳ھ

تمل ناڈو کے مسلمان تاجرانِ چرم کا مشہور اقامتی شہر میل وشارم میں ایک شاندار و باوقار مدرسہ ''مفتاح العلوم'' واقع ہے۔ اس کے مؤسس و بانی ملک التجار محترم جناب الحاج خضر حسین صاحب مرحوم و مغفور ہیں جو مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے رکن رکین اور جوائنٹ سکریٹری کے معزز عہدے پر فائز رہ چکے ہیں۔ مذکورہ مدرسہ کی تعمیر جدید کے افتتاح پر علامہ اشرف سعودی نے انتہائی حسین و مناسب ترین فارسی قطعۂ تاریخ کہا تھا جس میں عمارت کی دلکشی، طلبۃ العلوم کے اکرام و احترام کا ذکر، مدرسہ کا محل وقوع اور بانی مدرسہ کا اسم گرامی سبھی کچھ شامل ہے، ملاحظہ ہو۔

دل کشا تعمیر نو، دل خواہ جشنِ افتتاح شد فراوان و فروزاں شانِ مفتاح العلوم
طالبانِ علم را اعزاز و اکرامِ شہاں ضیفِ سردارِ رسل، مہمانِ مفتاح العلوم
یادگار آمد خضرؔ را در خضر آباد ایں باد دائم در جہاں فیضانِ مفتاح العلوم
گفت سالِ نیک فال اشرفؔ سعودی باقوی ''زینتِ عالم جدید ایوانِ مفتاح العلوم''

(چودہ سوتین) ۱۴۰۳ھ

دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کے استاذ قرات مولانا حافظ قاری اظہر حسین امروہوی ثم کرنولی کی وفات حسرت آیات پر انہوں نے ایسا لاجواب قطعہ کہا تھا جس سے فن تاریخ گوئی میں ان کی مجتہدانہ شان کی عکاسی ہوتی ہے۔

پیا ''اظہر حسن'' نے ''جامِ وصال'' لکھا اشرف نے ان کا سالِ سعید

۱۳۹۵=۱۲۲۴+۱۷۱

لکھا اشرف نے سن ''بصدق تمام'' ''نہ رہا قاریٔ کلام مجید''

۱۳۹۵ھ=۶۷۵+ ۷۲۰

ان کے بڑے بہنوئی محترم جناب الحاج پی محمد افضل صاحب زید اقبالہ کے والد بزرگوار رئیس شہر محترم الحاج پی عبدالسبحان صاحب (امیر جماعت تبلیغ، بلنج پور) کا انتقال ۱۹/ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۳/دسمبر ۱۹۷۵ء بروز چہارشنبہ ہوا تھا، آپ نے اس المناک واقعہ پر برجستہ و بلا تکلف تاریخی قطعہ کہا۔

آہ صاحب دلے رئیسِ شہر میرِ تبلیغ ، پیرِ دانا رفت

ہاتف غیب سالِ رحلتِ او ''عبد سبحاں بہشت یافت'' بگفت

(تیرہ سو پچانوے) ۱۳۹۵ھ

شہر بلنج پور کے نیک طینت، سادہ لوح مخلص تاجر محترم جناب وی عبدالشکور صاحب بڑے علم دوست تھے، موصوف کا شمار حضرت علامہ حافظ ابوالسعو د احمد باقوی (متوفی ۱۹۹۶ء) کے خاص حلقۂ احباب میں ہوتا تھا، ان کی وفات ایک ہزار تین سو چھیانوے میں ہوئی۔ انہوں نے اس غمناک موقع پر مرحوم کی صفات محمودہ پر مشتمل قطعہ تاریخ کہا تھا۔

جوہرِ صدق ، پیکرِ اخلاص صاحبِ حلم ، نرم طبع ، غیور

کتنی غمناک و رنج افزا ہے ''رحلتِ عبد نیک ، عبد شکور''

(تیرہ سو چھیانوے) ۱۳۹۶ھ

حضرت علامہ ابوالسعو د احمد باقویؒ کے ایک اور مخلص ترین و معتبر ترین دوست محترم

جناب الحاج وی عبدالما لک صاحب ولد جناب وی عبدالمجید صاحب مرحوم یکم/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ء مطابق ۲۰/اپریل ۱۹۷۷ء کو اس دارفانی سے ملک عدم کی طرف کوچ کر گئے تھے۔اس حادثہ پر ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا یہ قطعہ قارئین کو بھی متاثر کر رہا ہے۔

پیکر صدق و صفا ، صاحب اثر ، مہماں نواز عاشقِ قراں و عالم دوست ، شمعِ خانداں
سالِ رحلت کہہ دیا ہاتف نے یوں باچشمِ نم "عبدمالک،زیب محفل،پاک دل،خلدآشیاں"

(تیرہ سوستانوے)۱۳۹۷ھ

شہر جدوال (ویلور) کے متوطن مولانا محمد حسن باقوی مدرسہ باقیات صالحات کے قدیم فارغین میں سے تھے،ان کے وصال پر علامہ اشرفؔ سعودی نے درج ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے جس میں مولانا مرحوم کے اخلاق حسنہ کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

دریغا کہ اک عالم باعمل ستودہ شمائل ، شگفتہ سخن
چلا چھوڑ کر قلب جدوآل میں "غم پاک سینہ محمد حسن"

(تیرہ سواٹھانوے)۱۳۹۸ھ

دارالعلوم سبیل الرشاد کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین،امیر جماعت تبلیغ شہر بنگلور محترم جناب الحاج اکبر شریف صاحب کی رحلت پر مرحوم کی صفات عالیہ کا آئینہ دار قطعہ بھی انہوں نے رقم کیا تھا،جو قابل مطالعہ ہے۔

میر تبلیغ، تاجرِ ذی جاہ علم پرور ، خلیق ، طاعت کیش
سالِ رحلت بگفت ہاتف غیب "یاد اکبر شریف دور اندیش"

(چودہ سوتین)۱۴۰۳ھ

محترم الحاج پی محمد افضل صاحب زید لطفہ کی والدہ ماجدہ کا انتقال بتاریخ یکم جمادی الثانی ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۶/نومبر ۱۹۹۳ء بروز سہ شنبہ ہوا تھا اس جانکاہ حادثہ پر متاثر کن تاریخی قطعہ تحریر کیا۔

مادرِ مہرباں عظیمہ بی عظمتِ خانداں عظیمہ بی
سالِ رحلت بگفت ہاتفِ غیب "بسرائے جناں عظیمہ بی"

(چودہ سو چودہ) ۱۴۱۴ھ

شہر ''میل وشارم'' کے قلب میں ایک مخلص نیک اطوار و بلند کردار تاجر الحاج آنکم صفی اللہ نے آج سے سینتیس (۳۷) سال پیشتر اپنے صرف خاص سے ایک معیاری دینی درسگاہ اور بے حد خوبصورت مسجد ایک ہی احاطے میں تعمیر کی تھی، حضرت اشرف سعودی نے جو مذکورہ مقتدر ادارے کے سرپرست بھی ہیں، تعمیر مسجد کی تاریخ بڑے ہی پُر معنی الفاظ اور موزوں ترین مصرعے میں بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

خوشا کہ تاجرِ عالی ہمم صفی اللہ بساخت مسجد رفعت مقام باب نجات
بگفت ہاتف غیبی سنِ رواں اشرفؔ ''نشانِ کعبۂ مقصود مسجد الحسنات''

(تیرہ سو پچانوے) ۱۳۹۵ھ

علاوہ ازیں انہوں نے تاجر موصوف جناب صفی اللہ صاحب کے انتقال پر بڑے پُر اثر انداز میں ہجری وعیسوی قطعہ ہائے تاریخ کہے ہیں۔

آہ فیاضِ دہر ، محسنِ قوم پاک باطن سخی صفی اللہ
فخرِ تجارِ قدردانِ کمال علم پرور غنی صفی اللہ
بانی و صدرِ منبع الحسنات یارِ ضیفِ نبیؐ صفی اللہ
ہاتفِ غیب نے کہا اشرفؔ ''ارتحالِ تقی صفی اللہ''

(تیرہ سو چھیانوے) ۱۳۹۶ھ

بست رختِ سفر آنکم صفی اللہ خلیق و مخلص و فرّخ نہاد و نیک صفات
سن وفات بگفتا سروش غیب اشرفؔ ''غمِ مؤسسِ بنیانِ مسجد الحسنات''

(انیس سو چھہتر) ۱۹۷۶ء

علامہ اشرف سعودی زباں کے غنی اور قلم کے دھنی ہیں، ان کے موثر و مسحور کن خطبات اور گراں مایہ و بلند پایہ علمی وادبی مضامین ابھی تک منتظرِ ترتیب واشاعت ہیں، خدا کرے کہ جلد از جلد یہ مجموعے جلوہ گر ہوجائیں تا کہ اک جہانِ علم کو ان سے مستفیض ہونے کا موقع میسر آجائے۔

مولانا حافظ باقویؒ: مولانا حافظ عبدالرزاق باقوی ولد محمد دستگیر صاحب رائچوٹی ضلع

کڈپہ (آندھرا) کے متوطن تھے، مگر مدرسۂ باقیات صالحات سے فراغت کے بعد اپنی ساری زندگی مدراس اور میل وشارم میں گزار دی جہاں نواب سی، عبدالحکیم کالج میں بطور اردو لکچرار تقرر ہوا تھا۔ اپنی مرنجاں مرنج طبیعت، حسن اخلاق اور منکسر المزاجی کی وجہ سے عوام وخواص میں کافی مقبول و ہر دل عزیز تھے۔ وہ فرزندانِ باقیات میں ان معنوں میں ممتاز ہیں کہ انہوں نے ادبی زندگی میں متعدد کارہائے نمایاں انجام دیے، جیسے بچوں کے لیے مجموعہ ہائے نظم ''ننھے پھول'' (مطبوعہ ۱۹۷۲ء کتاب گھر، میل وشارم) ''چاند تارے'' (مطبوعہ ۱۹۸۱ء اردو اکادمی، آندھرا پردیش) ''پھلواری'' (مطبوعہ ۱۹۸۲ء کتاب گھر، میل وشارم) کے ذریعہ ادب اطفال میں گرانقدر اضافہ فرمایا۔ علاوہ ازیں انہوں نے نواب سی، عبدالحکیم (متوفی ۱۹۳۸ھ) کا تذکرہ ''مخیّر اعظم'' (مطبوعہ ۱۹۷۵ء) اور ایم فل کا تحقیقی مقالہ ''وشارم میں اردو'' (مطبوعہ ۱۹۸۹ء) شائع کروا کر اپنا نام تذکرہ نویسوں کی تاریخ میں محفوظ کر لیا۔ مزید برآں ان کے شعری مجموعے ''ذکر حبیبؐ'' (مطبوعہ ۱۹۸۱ء) ''بہارِ سخن'' (مطبوعہ ۱۹۸۷ء) ''قمر نامۂ اسلام'' منظوم سیرت طیبہ (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) ''نور علی نور'' زیور طباعت سے آراستہ ہو کر مقبول خاص وعام ہوئے ہیں۔

فن شاعری میں حضرت حافظ باقوی کو علامہ فدوی باقوی سے شرف تلمذ حاصل تھا، تاریخ گوئی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انہوں نے دوست واحباب کی فرمائش پر بہت سی تاریخی نظمیں کہیں، ان میں سے بطور یادگار بعض قطعات کے منتخب اشعار یہاں نقل کئے جارہے ہیں۔

اے ریاض علم و حکمت، باقیات صالحات　　جشن صد سالہ سے تیرے خوش ہے دنیائے حیات
تو جنوبی ہند کا وہ آفتابِ علم ہے　　بن گئی ہے بقعۂ انوار جس سے کائنات
علم دیں کا بالیقیں آباد سرچشمہ ہے تو　　ہیں رواں ہر سو جہاں میں سیکڑوں تیرے فرات
ہے خلوصِ دل سے حافظ کی دعا خلاّق سے　　تا ابد شاداب ہو تیرا یہ گلزارِ حیات
سال ہجری خود نمایاں کر رہا ہے شان سے　　''جلسۂ صد سالۂ الباقیات الصالحات''

(تیرہ سو چورانوے) ۱۳۹۴ھ

مدرسۂ منبع الحسنات، میل وشارم کی افتتاحی تقریب کے موقع پر ایک بلیغ نظم کہی تھی جس کے آخر میں قطعۂ تاریخ اس طرح مرقوم ہے۔

ہے طلوعِ آفتاب منبع الحسنات آج　　رشک صد مہتاب وانجم بن گئے ذرات آج
رحمت ہادی کے دروازے وشارم پر کھلے　　ہورہی ہے خوب حافظؔ بارشِ برکات آج
فکر تھی تاریخ کی ، حافظؔ نے برجستہ کہا　　لکھ دے حافظؔ ''شان شانِ منبع حسنات آج''

(تیرہ سوستاسی) ۱۳۸۷ھ

حضرت مولانا افضل العلماء الحاج محمد اسماعیل نیر ربانی صاحب (متوفی ۱۹۹۳ء) نوراللہ مرقدۂ کی دختر نیک اختر کی شادی عزیز القدر حافظ وی، پی، انیس احمد سلمہ ابن محترم جناب وی، پی، عبدالمالک مرحوم ومغفور کے ساتھ بتاریخ ۸/شوال ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲/اپریل ۱۹۹۲ء بروز یکشنبہ شہر میل وشارم میں منعقد ہوئی۔ اس مسرت وشادمانی کے موقع پر محترم حافظؔ باقوی نے ایک خوبصورت تہنیتی نظم کہی، اس نظم کے اختتام پر انہوں نے رعنائیوں سے بھرپور قطعۂ تاریخ سنا کر اہل محفل کو محظوظ فرمایا، قارئین بھی اس سے حظ اٹھائیں۔

تعمیلِ حکمِ رب ہے ، سنت کی پیروی ہے　　کیف و سرور افشاں پُر نور زندگی ہے
ترویج مہر و مہ کی پھیلی ہوئی ہے رونق　　ہرسمت نور و نکہت ، ہرسمت روشنی ہے
کیا شان کیا طراوت اس بزم تہنیت کی　　رعنائیوں کا پیکر ہر پھول ، ہر کلی ہے
مسرور ہوکے حافظؔ ، تاریخِ عقد کہہ دو　　''شادی بلند طالع ذکیہ انیس کی ہے''

(چودہ سوبارہ) ۱۴۱۲ھ

ڈاکٹر راہی فدائی:　ظہیر احمد باقوی نام اور راہیؔ فدائی تخلص ہے، شہر کڈپہ (آندھرا) کے متوطن ہیں، والد محترم الحاج ٹی، یوسف نائک وظیفہ یاب تحصیل دار (متوفی ۱۹۹۲ھ) نے انگریزی تعلیم سے ان کا دامن چھڑا کر ابتدائی دینی تعلیم کے لیے حضرت علامہ سید شاہ محمد یعقوب صاحب بغدادی باقوی (۲۰۰۰ء) کے حوالے کردیا، علامہ بغدادی عربی، فارسی اور اردو کے ماہر تھے، مولانا رومیؒ اور علامہ اقبالؔ ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ راہیؔ کے ذوق شعری کے ابتدائی نقوش کڈپہ کے ادبی ماحول اور علامہ بغدادی کی نورانی صحبتوں کے مرہونِ منت ہیں۔ حفظ قرآن مجید اورعربی وفارسی کی دوسالہ تعلیم کے بعد علامہ نے راہیؔ کو ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات ویلور میں ۱۹۶۷ء- ۱۹۶۸ء کے تعلیمی سال کے دوران شریک کرادیا۔ جہاں شیخ التفسیر علامہ سید شاہ

عبدالجبار قادری باقوی (متوفی ۲۰۰۳ء) علامہ محمد جعفر حسین باقوی فیضی صدیقی (متوفی ۲۰۱۰ء)، علامہ رئیس الاسلام باقوی (متوفی ۲۰۱۲ء)، علامہ فدوی باقوی (متوفی ۱۹۹۳ء) وغیرہ اساتذۂ کرام کے زیر سرپرستی راہی کے ذہن ودل کے کھلے آنگن میں علم وادب کا شوق پروان چڑھتا رہا، ۱۹۷۲ء میں نصاب تحصیل (مولوی عالم) سے اور ۱۹۷۴ء میں نصاب مطول (مولوی فاضل) سے فارغ ہوگئے تو ان کے مشفق اساتذہ نے انہیں مادر علمی ہی میں تدریسی خدمات پر مامور کردیا۔ فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ راہی کی ادبی کاوشیں بھی جاری رہیں، جس کے نتیجہ میں ''باقیات ایک جہاں'' (نثری تالیف) ۱۹۸۰ء میں اور ''تصنیف'' (شعری مجموعہ) ۱۹۸۱ء نے علمی وادبی حلقوں میں شرف قبولیت حاصل کیا۔ تصنیف وتالیف کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ دسویں شعری تصنیف ''استجاب'' (مطبوعہ ۲۰۱۲ء) اور پندرھویں نثری کتاب ''مدرکات'' (مطبوعہ ۲۰۱۳ء) اس کی مثالیں ہیں۔

راہی فدائی نے فن شاعری وتاریخ گوئی میں علامہ فدوی باقوی سے اکتسابِ فیض کیا ہے، تکمیل فن کا تو دعویٰ نہیں مگر جس قدر بھی حصول یابی ممکن ہوئی ہے اس سے لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کے مصداق تاریخ گو شعراء کی صف میں خود کو شامل کرنے کی سعی کی گئی۔ چند مثالیں ہدیۂ اہل نظر ہیں۔

راہی فدائی کے مشفق ومربی ومحسن ومرشد حضرت علامہ سید عبدالجبار صاحب قادری باقوی کا وصال ۲۲/ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۳/جون ۲۰۰۳ء بروز دوشنبہ بمقام ویلور ہوا۔ راہی نے نظم تعزیت کے ذریعہ اپنے شیخ کے امتیازات کو بیان کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا ہے اور نظم کے اختتامی دوشعروں میں بالترتیب سن عیسوی اور سن ہجری کی تخریج کی ہے۔ نظم کے اشعار درج ذیل ہیں۔

قدوۂ دین ونازش اخیار اور علامۂ فرشتہ شعار
شیخ تفسیر و زبدۃ العلما مرشدِ وقت ، صاحبِ اسرار
ماہر فقہ اور شیخ حدیث فخرِ ابرار و منبعِ انوار
جو ہیں چشم وچراغ آل رسولؐ جن کا نامِ گرامی دیں کا وقار
نائب شاہِ مرسلاں تھے آپ سیدِ شاہ حضرت جبار

یوم دوشنبہ جون کی تیئس دے گئے داغِ ہجر وقت نہار
مصرعِ سالِ رحلت شیخی میں نے چاہا بہ رحمتِ غفار
یہ ندا آئی برسرِ ہاتف "باغ جنت ہوا ہے جائے قرار"
۵ ۲۰۰۳ء=۵+۱۹۹۸
آس کے ساتھ قبر پر راہؔی "بارشِ نور برسے لیل و نہار"
۶۱ ۱۴۲۴ھ=۶۱+۱۳۶۳

راہؔی کے ایک فرزند سلمان احمد ذہنی لحاظ سے معذور تھے، وہ بتاریخ ۲۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۴ھ مطابق ۳۰/ جولائی ۲۰۰۳ء بروز چہارشنبہ اچانک ایک حادثہ میں انتقال کر گئے۔ اس جاں گسل سانحے سے متاثر ہوکر انہوں نے تعزیتی نظم کہی تھی۔ جس کے آخری دو شعروں میں سے اول میں عیسوی سال برآمد ہوتا ہے۔ اور دوم میں صنعتِ تخرجہ کے سبب ہجری سال کا استخراج ہوتا ہے۔

بخت کے ہاتھوں ہم ہوئے مجبور پل میں بدلا ہے نام قرب کا دور
آخرش اس نے نقش ثبت کیے رہ گیا درد مٹ گیا ناسور
آبلے دل کے ایسے روشن ہیں جوں تجلی سے چمکے کوہِ طور
کاش جنت میں وہ ملے ہم سے کون پوچھے گا پھر تو حور وقصور
لائقِ داد اس کا الھڑ پن قابلِ دید چہرۂ پُرنور
کیوں نہ باندھے وہ اپنا رختِ سفر مل گیا اس کو اذنِ ربّ غفور
مٹ نہ پائے گا دل سے داغ فراق دارِ الفت ہے جاوداں معمور
چل دیا ہے متاعِ دل لے کر "باغ جنت کو آج وہ مسرور"
(دوہزارتین) ۲۰۰۳ء
ہو دعا اپنی بے زمن مقبول "قبر سلماں پہ برسے بارش نور"
۹۷ ۱۴۲۴ھ=۱۵۲۱-۹۷

ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات، ویلور ہندوستان کا سب سے قدیم باقاعدہ مدرسہ ہے، جس کا قیام ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء میں اعلیٰ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب قادری قدس سرہ

کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ماشاء اللہ اس کی عمر عزیز ڈیڑھ سو سال سے زائد ہو چکی ہے۔ اسی مناسبت سے مدرسہ کے ذمہ داروں نے فیصلہ کیا کہ اس قدیم و عظیم دینی درسگاہ کا ''جشن اک صد و پنجاہ سال'' منایا جائے۔ راہؔی فدائی نے اس جشن کے سلسلہ میں ایک طویل نظم کہی ہے جس کے چند منتخب شعر ہدیہ قارئین کیے جا رہے ہیں۔

تو نہیں فتنوں کا گاہک باقیات صالحات
معتدل ہے تیرا مسلک باقیاتِ صالحات

تیرے در پر شوق سے وارفتگانِ علم و فن
با ادب دیتے ہیں دستک باقیاتِ صالحات

تیری عظمت، تیری رفعت، قامتِ زیبا ترا
آسماں تیرے قدم تک باقیاتِ صالحات

فضل رب، فیض شہ دیں، زائد از پنجاہ و صد
عمر تیری ہے بلا شک باقیاتِ صالحات

بام و در ہیں ضوفشاں جشنِ طرب سے راہؔیا
''وَاہ وَہ، ہو صد مبارک باقیاتِ صالحات''

(چودہ سو پینتیس) ۱۴۳۵ھ

اس مقالے کی تیاری میں راقم الحروف، مولانا حافظ قاری امتیاز احمد رشادی مدظلہ مہتمم مدرسہ رشیدیہ، ویلور کے تعاون سے مستفیض ہوا ہے۔ جزاہ اللہ خیر

شہزادی جہاں آرا بیگم کی کتاب "مونس الارواح" کا مختصر تجزیہ

ڈاکٹر حنا یاسمین

فارسی شعر و ادب کا بہت بڑا حصہ متصوفانہ افکار و خیالات کی پیش کش پر مشتمل ہے اور صوفیائے کرام کی حیات و خدمات، افعال و اقوال، ملفوظات و فرمودات اور افکار و خیالات طویل عرصہ سے علماء و فضلا اور ادبا و شعراء کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ شہزادی جہاں آرا بیگم خاندان تیموریہ کی پہلی ادیبہ و شاعرہ ہیں جو صوفیہ کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئیں اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ تصوف کو اپنا شیوہ بنایا بلکہ اس موضوع پر تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیا۔

جہاں آرا بیگم شاہ جہاں کی دوسری اولاد تھیں (۱)۔ وہ ۱۰۲۳ھ کو لاہور میں پیدا ہوئیں (۲)۔ ان کی ماں ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل تھیں۔ 'فاطمۃ الزماں' جہاں آرا بیگم کا اعزازی لقب تھا۔ معاصر مورخین مثلاً عبدالحمید لاہوری و محمد صالح کنبو وغیرہ نے انہیں 'بیگم صاحب' اور 'بادشاہ بیگم' کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ (۳)

شہزادی نے بچپن میں قرأت قرآن، خط اور فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی اور شعر و ادب اور انشاء میں خاصی مہارت حاصل کی (۴)۔ ان کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ستی النساء خانم کے سپرد تھی جو ملک الشعراء طالب آملی کی بہن اور حکیم رکنا کاشی کے بھائی نصیرا کاشی کی بیوی تھیں اور حافظ قرآن ہونے کے علاوہ علم قرأت، علم طب اور ادب شناسی میں بھی امتیازی حیثیت رکھتی تھیں۔ (۵)

شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

شاہ جہاں، جہاں آرا بیگم کو اپنی تمام اولاد میں بہت محبوب رکھتے تھے۔ انہیں چھ لاکھ روپے سالانہ کا گراں قدر وظیفہ ملتا تھا (۶)۔ جہاں آرا بھی اپنے والد کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ وہ تمام عمر ان کی فرماں بردار اور خدمت گزار رہیں۔ بادشاہ کی معزولی پر قید و بند کے ایام میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

جہاں آرا بیگم نے تمام عمر شادی نہیں کی۔ وہ اپنے سالانہ وظائف رفاہ عام اور بھلائی کے کاموں میں خرچ کر دیا کرتی تھیں (۷)۔ انہوں نے لاہور میں ایک خانقاہ (۸) اور آگرہ میں جامع مسجد بھی تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجد فتح پور سیکری میں اکبر کی بنوائی ہوئی مسجد کے بعد مغلوں کے عہد کی سب سے پہلی وسیع اور فراخ مسجد ہے، جس سے ملحق ایک مدرسہ بھی تھا۔ (۹)

جہاں آرا بیگم کی وفات ۱۰۹۲ھ میں ہوئی۔ ان کی اپنی وصیت کے مطابق انہیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کے صحن میں سنگ مرمر کے ایک سادہ سے مقبرے میں جو شہزادی نے خود بنوایا تھا، دفن کیا گیا۔ ان کی قبر پر ان ہی کا یہ شعر کندہ ہے:

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ خاک پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است (۱۰)

جہاں آرا بیگم علمی و ادبی حیثیت سے بھی منفرد شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کے منظوم کلام میں حمد، نعت، رباعی، مرثیہ اور متفرق اشعار پائے جاتے ہیں۔ منثور آثار میں شہزادی کے رقعات بنام عالم گیر اور بنام راجہ بدھ پرکاش شائع ہو چکے ہیں۔ یہ خطوط مصنفہ کی عمدہ انشاء پردازی کا نمونہ ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے ذریعہ شاہ جہانی دور کی سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور معاشرتی زندگی کی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ متصوفانہ موضوع پر ان کی دو مستقل تصانیف ہیں:

۱- مونس الارواح۔ ۲- صاحبیہ۔ (۱۱)

''مونس الارواح'' مصنفہ کی سب سے پہلی تالیف ہے جو ۱۰۴۹ھ میں لکھی گئی۔ اس میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے احوال درج ہیں اور سلسلۂ چشت کے دوسرے مشائخ کا ذکر بھی ملتا ہے۔

''صاحبیہ'' ۱۰۵۱ھ میں تالیف ہوئی۔ یہ ملا شاہ قادری کی نامکمل سوانح عمری ہے۔

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں مونس الارواح کے چار خطی نسخے موجود ہیں:

پہلا نسخہ ۱۰۵۳ھ کا مکتوبہ اور ۴۶ اوراق پر مشتمل ہے جو یونیورسٹی نمبر ۸۰ پر موجود ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ساڑھے تین صفحہ کا ضمیمہ بھی شامل ہے۔اس ضمیمہ میں ۱۰۵۳ھ کے جہاں آرا بیگم کے سفر اجمیر کی روداد رقم ہے۔نسخہ کرم خوردہ ہے اور ہر سطر کے شروع میں دو تین الفاظ اصلاح و مرمت کی نذر ہو گئے ہیں۔

دوسرا نسخہ مکتوبہ ۱۱۵۰ھ کا ہے جو عبدالسلام کلکشن میں ۳۸/ ۹۴۳ کے تحت ہے۔اس نسخہ میں ضمیمہ شامل نہیں ہے، اوراق کی تعداد ۹۷ ہے۔

تیسرا نسخہ یونیورسٹی نمبر ۸ کے تحت ہے جو ۱۲۷۶ھ کا لکھا ہوا ہے، اس میں ضمیمہ شامل ہے، کل اوراق ۶۶ ہیں۔

چوتھا نسخہ یونیورسٹی نمبر ۱۸ کے تحت ہے، اس پر تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ یہ ۵۵ اوراق پر مشتمل ہے۔

یہ چاروں نسخے صاف خط نستعلیق میں رقم ہیں اور آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔

میں نے اپنے مقالے کے لیے سب سے قریب العہد نسخے مکتوبہ ۱۰۵۳ھ کو بنیاد بنایا ہے اور جہاں کوئی مشکل پیش آئی ہے دوسرے قریب العہد نسخے یعنی نسخہ مکتوبہ ۱۱۵۰ھ سے مدد لی ہے۔

''مونس الارواح'' کی ابتدا دیگر صوفیہ کی کتب کی طرح خدا کی حمد و ثنا سے ہوتی ہے، جس کے بیان میں اپنی عاجزی کا عمدہ پیرایہ میں اعتراف کرتے ہوئے مصنفہ نے نثر و نظم کی مدد سے اپنا مافی الضمیر واضح کیا ہے:

''خداوندا ملکا بادشاھا ہر گاہ زبان انبیاء مرسل و فرشتہای مقرب از ادای حمد و ثنای تو عاجز باشد ایں ضعیفہ را چہ یارا کہ در وصف تو زبان تواند کشاد۔

آنجا کہ کمال کبریائی تو بود   عالم نمی از بحر عطائی تو بود
ما را چہ حد حمد و ثنائی تو بود   ہم حمد ثنای تو سزائی تو بود[۱۲]''

صوفیائے کرام کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے سے ایک امر جس کا ذکر بہت زیادہ سامنے آتا ہے، وہ ہے 'کرامت'۔ لہٰذا صاحبِ کتاب نے اپنے موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے

درود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر معجزاتی واقعہ 'شق القمر' کو فنکارانہ طور پر اجاگر کرتے ہوئے آپؐ کو 'شگافندہ ماہ' قرار دیا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مطالعہ میں رہا کرتی تھیں۔

تقریباً تمام صوفیائے کرام کے یہاں یہ روایت رہی ہے کہ وہ رسول قدسی کی ذات کو مخلوق کے خلق کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ جہاں آرا پر بھی یہ روایتی فکر اثر انداز ہوئی ہے، لہٰذا نعت گوئی کے وقت اس کے اشعار اسی بات کی شہادت دیتے ہیں۔ وہ مدلل انداز میں لکھتی ہیں:

احمد مرسل کہ خرد خاک اوست   ہر دو جہاں بستہ فتراک اوست

سلطان رسل کز ہمہ پاک آمد   ذاتش سبب خلقت افلاک آمد

در شان شریف او حدیث قدسی   لولاک لما خلقت الافلاک آمد (۱۳)

حمد و نعت کے بعد اس کتاب میں خلفائے راشدین کی عظمت اور بزرگی نثر و نظم کے حسین امتزاج سے دل نشین پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں اور جیسا کہ ذکر کیا گیا یہ کتاب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس پس منظر میں مصنفہ نے اولیاء کے ورود مسعود کی وجہ، ان کی اہمیت، مقام، ان سے منسلک ہونے کے فوائد، متفرق سلاسل کے قاعدوں اور مشائخ کی دسترس کے بارے میں مدلل انداز میں گفتگو کی ہے۔ قرآنی آیات اور احادیث کے مطالب سے بھی استفادہ کیا ہے اور اپنے اسلوب کو تزئین بخشی ہے۔ لکھتی ہیں:

''بداں کہ حضرت اللہ سبحانہ و تعالیٰ وجود مسعود اولیاء را قدس اللہ اسرارہم موجب ثبات واستقرار عالم و عالمیان گردانیدہ واز برکت اقدام سعادت التزام ایشاں روح اللہ ارواحہم جہاں و جہانیان را استقامت و مدار بخشیدہ و جمیع فیوضات و برکات از یمن انفاس متبرکہ ایں گروہ والاشکوہ از آسمان بہ زمیں می آمد ہر سعادت مندی کہ از روی عقیدت خاص کمتر ارادت و اخلاص ایشاں برمیان جان بستہ ازاں فیض بہرہ تمام و فائدہ مالا کلام میر باید وحق جل و علا دوستی و ارادت و اخلاص ایں فرقہ علیہ را وسیلہ ونجات مومناں و واسطہ وحصول بدرجات جہاں و موجب خلاصی از درکات نیز آں ساختہ ومحض از کمال کرم ازلی

ولطف لم یزلی طریقۂ پیری ومریدی وقاعدہ سلسلہا راکہ مال حال مسلمانان بداں انتظام دارد ودرمیان ایشاں پدید آوردہ ومومنین ومومنات را فرقہ فرقہ وگروہ گروہ بہر یک ازاں سلاسل مبسوط ومربوط گردانیدہ وایں امر را سبب رستگاری درروز قیامت ساختہ چہ دراں روز کہ درشان آں آیۃ کریمہ ''یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ وَ اُمِّہٖ وَ اَبِیْہِ وَ صَاحِبَتِہٖ وَ بَنِیْہِ'' وارداست ۔(۱۴)

روز قیامت سے متعلق مزید تشریح کرتے ہوئے مصنفہ نے اپنے عقائد کی بھی وضاحت کی ہے۔ جہاں آرا بیگم اس بات کی معتقد ہیں کہ اس دن مریدین اپنے اپنے پیروں کی وساطت سے شفاعت پائیں گے۔ ملاحظہ ہو:

''ومقدار آں روز برابر بہ پنجاہ ہزار سال خواہد بود وانواع فزع واہوال بانسان روی خواہند نمود وحلقہای صفہای مریدان در سایہ علم پیران خود خواہند ایستادواز برکت آں بزرگان دین ازاں اہوال ایمن خواہند بود''۔(۱۵)

ان سطور کے بعد جہاں آرا نے موثر لہجے میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے سلسلۂ چشتیہ میں اپنے مرید ہونے کا ذکر کیا ہے اور ہندوستان میں اس سلسلہ کے بانی خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ذکر کی ابتدا ان عقیدت مندانہ اشعار سے کی ہے:

آں شہنشاہِ جہاں معرفت ذات او پر دن ز ادراک وصفت
خسرو ملک آفتابی تخت و تاج از خود و از غیر خود بی احتیاج
غرق بحر عشق از صدق و صفا از خودی بیگانہ با حق آشنا
کردہ مرغ ہمتش ز اوج کمال بیضہ افلاک را در زیر بال
اختر برج سپہر لم یزل گوہر درج کمال بی بدل
آں معین الدین و ملت بی نظیر فارغ از دنیا بملک دین امیر
در ثنای او زبانم را چہ حد فیض او باید کہ فرماید مدد (۱۶)

''مونس الارواح'' میں جہاں آرا بیگم نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے اپنے رسالے کا یہ نام کیونکر تجویز کیا۔ چونکہ مصنفہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ملفوظات، ان کے

رسائل، ان سے متعلق لکھے گئے رسائل کا برابر مطالعہ کیا کرتی تھیں اور ان سے استفادہ کرتی رہتی تھیں، انہوں نے مناسب سمجھا کہ:

''بمناسبت اسمی رسالہ کہ حضرت پیر دستگیر نوشتہ انیس الارواح نام کردہ انداین مرید عقیدت مند نیز ایں رسالہ را موسوم بہ مونس الارواح کردانید''۔(۱۷)

مریدان چشتیہ کے متعلق جہاں آرا کا مطمح نظر یہ ہے کہ:

''امیدوار است کہ ہر کسی بر کشتی ارادت چشتیان نشیند اللہ سبحانہ وتعالیٰ اورا از تلاطم امواج بحر عصیان نجات بخشیدہ بساحل مراد رساند''۔(۱۸)

کتاب میں مصنفہ نے انیس العارفین، سیر العارفین، اخبار الاخیار وغیرہ کے جگہ جگہ حوالے دیے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کتاب کی تالیف میں ان سے مدد لی ہے۔ سفینۃ الاولیا سے بھی چند واقعات نقل کیے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب مونس الارواح سے پہلے تصنیف ہو چکی تھی، اگرچہ دونوں کا سال تصنیف ۱۰۴۹ھ ہے۔

''مونس الارواح'' میں اس دور کی مرصع نثر نگاری کے عمدہ نمونے بھی جا بجا موجود ہیں۔ چونکہ شاہ جہانی دور شان وشوکت کا دور تھا، لہٰذا ادب کا میدان بھی اس سے متاثر تھا۔ سادہ نثر نگار بھی الفاظ کی بازی گری کے قائل تھے اور بالخصوص القاب وآداب میں طویل جملہ آرائی دلکشی عبارت کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ معزز ومحترم ہستیوں کے لیے ابتداءً چند عمدہ القاب تحریر کیے جاتے اور پھر نام نامی کا ذکر ہوتا۔ جہاں آرا نے بھی اس کا التزام کرتے ہوئے کہیں کہیں عبارت کی تزئین کاری لفاظی کے ذریعہ کی ہے۔ مثلاً خواجہ معین الدینؒ کا ذکر شروع کرتے وقت لکھتی ہیں:

''ذکر احوال سعادت مال حضرت قطب الاولیاء سند الاتقیای گوہر معدن تحقیق لولوی لجۂ تصدیق نیر آسمان معرفت مہر سپہر حقیقت عالم علوم ولایت دانای اسرار ہدایت سرور سربر حق ویقین غوث الاسلام والمسلمین معین الملۃ والحق والدین محمد الحسن الحسینی السنجری الچشتی قدس اللہ سرہ العزیز''۔(۱۹)

اس کتاب میں ذاتی حوالے سے چند دلچسپ واقعات بھی موجود ہیں جن کا ذکر دوسری

کتب میں نہیں ملتا۔ مثلاً مندرجہ ذیل واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں اور جہاں آرا کے درمیان علمی معاملات پر بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی اور بادشاہ بغیر واضح دلیل کے کسی قول کو معتبر نہیں سمجھتے تھے۔ جہاں آرا کی معصوم شخصیت بھی بین السطور نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''معلوم ہم گناں باد کہ حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الحق والدین محمد قدس اللہ سرہ از سادات حسینی بودہ اند و بلاشبہ از اولا د امجاد حضرت سید المرسلین اند صلی اللہ علیہ وسلم و دریں سخنی نیست چوں بادشاہ عصر حضرت خلافت پناہ صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ خلد اللہ ملکہ کہ والد ماجد ایں ضعیفہ اند بر حقیقت سیادت حضرت پیر دستگیر اطلاع نداشتند بنابراں در تفحص ایں امر بودند و ایں فقیر مکرر گفت کہ ایشاں سید بودند باور نمی کردند تا آں کہ روزی اکبر نامۂ مطالعہ می نمودند شیخ ابو الفضل حقیقت سیادت حضرت پیر دستگیر و شمہ از احوال سعادت اشتمال آں حضرت را در اکبر نامہ ذکر کردہ بنظر مبارک ایشاں در آمد آں روز ایں معنی کہ روشن تر از آفتاب بود بر بادشاہ ظل اللہ ظاہر گشت''۔(۲۰)

''مونس الارواح'' میں خواجہ صاحب ہی کی نسبت سے متعدد دلچسپ تشریحات بھی شامل کی گئی ہیں۔ مثلاً اجمیر کی وجہ تسمیہ کیا ہے، جہاں آرا بیگم کے مطابق اس کا نام اجمیر اس وجہ سے ہے کہ اجا نام کا ایک راجہ تھا جو غزنین کے حدود تک تصرف رکھتا تھا۔ ہندوستان کے شاستر کی زبان میں اجا آفتاب کو کہتے ہیں اور میر ہندوی زبان میں کوہ کو کہتے ہیں، چنانچہ راجہ اور اس شہر کی پہاڑیوں کی مناسبت سے ''اجمیر'' مشہور ہوا۔(۲۱)

اسی طرح سلسلۂ چشتیہ کی وجہ تسمیہ سے متعلق ان خاتون محترم نے کتب تاریخ و تصوف کے اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''چشت نام قصبہ ایست از ولایت خراسان چوں اکثر اولیاء اللہ مثل خواجہ ابو اسحاق چشتی و حضرت خواجہ ابو احمد ابدال چشتی و حضرت خواجہ ابو محمد چشتی و حضرت خواجہ ناصر الدین یوسف چشتی و حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی قدس اللہ اسرارہم ازاں قصبہ بودند بنابراں ایں سلسلہ را چشتیہ می گویند و ہر کس

ازمریدان ایشانست اورا چشتی می نامند وحضرت پیر دستگیر خواجہ معین الدین حسن سنجری روح اللہ روحہ در ہمیں سلسلہ چشتیہ مرید شدہ اند''۔(۲۲)

کتاب میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے علاوہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ فریدالدین مسعود اجودھنیؒ، شیخ نظام الدین بداونیؒ اور شیخ نصیرالدین محمود اودھیؒ کے احوال بھی درج ہیں۔ سیر العارفین کے حوالے سے یہ بات بھی نقل کی گئی ہے کہ حضرت شیخ نصیرالدین محمود نے اپنا خرقہ خلافت کسی کو عطا نہیں کیا تھا بلکہ ان کی تدفین کے وقت ان کی وصیت کے مطابق خرقہ، عصا، تسبیح، کانسہ، چوبین اور نعلین ان کے ساتھ ہی قبر میں رکھ دیے گئے تھے۔(۲۳)

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو کاکی کیوں کہا جاتا ہے؟ جہاں آرا بیگم کی تحقیق کے مطابق:

''حضرت قطب الملۃ را کاکی ازاں گویند کہ فقر برایشاں غالب بود حرم محترم حضرت ایشاں بعد از یک فاقہ و دو فاقہ از زاغ بقالی آں قدر کہ کفاف شود قرض می کردند روزی زن مذکور حرفی نا ملایم کفت حرم ایشاں بہ عرض رسانید کہ او چنیں گفتہ فرمودند کہ بعد ازیں از وقرض نکنید وطاقی کہ در حجرۂ ماست بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کفتہ و دست دراں طاق کردہ بقدر احتیاج کاک از آنجا بردارید و قوت خود و دیگر وابستگان ساز ید چنیں می کردند کاہائے کرم از قدرت الٰہی بیرون می آمد وقوت عیال وفقرا می شد''۔(۲۴)

اسی طرح فریدالدین گنج شکر کے لقب کی توجیہ پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ انہیں گنج شکر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دہلی میں ان تک کھانے کی کوئی چیز نہ پہنچی اور انہوں نے افطار نہیں کیا تھا۔ پیر کی خدمت میں حاضری دینے جا رہے تھے، ضعف کے باعث ان کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ گر پڑے۔ تھوڑا سا پانی ان کے منہ سے نکل پڑا اور وہ خدا کی قدرت سے شکر بن گیا۔ جب اپنے پیر کی خدمت میں پہنچے تو حضرت خواجہ نے فرمایا۔ فریدالدین جو پانی تمہارے منہ سے نکلا، وہ شکر ہو گیا تو کیا تعجب ہے کہ اللہ نے تمہارے وجود کو گنج شکر بنا دیا ہے اور وہ ہمیشہ شیریں رہے گا۔ انہوں نے سر نیاز زمین پر رکھ دیا۔ جب وہاں سے واپس آئے تو جو شخص ان کو دیکھتا، کہتا کہ فریدالدین مسعود گنج شکر آ رہے ہیں۔(۲۵)

جہاں آرا بیگم نے اس کتاب کی تالیف میں بقول خود حتی الامکان احتیاط ملحوظ خاطر رکھی ہے اور جو کچھ اعتقادات اس میں تحریر کیے ہیں موصوفہ بھی ان کی صد فی صد حامی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''احوال ایں بزرگان را کہ مقربان درگاہ صمدیت انداز کتب و رسائل معتبر با حتیاط تمام برون آوردہ بقید تحریر آوردہ شد و اعتقاد ایں ضعیفہ آنچہ دریں رسالہ ثبت کردید حقیقت تام دارد''۔(۲۶)

''مونس الارواح'' کے اختتام پذیر ہونے کے بعد جہاں آرا ۱۰۵۳ھ میں اپنے والد کے ساتھ اجمیر گئیں اور وہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضہ پر حاضری دی۔ اس موقع سے متعلق اپنے تاثرات کو لکھ کر ایک ضمیمہ کی شکل میں انہوں نے اس کتاب میں منسلک کیا ہے۔ یہ ضمیمہ اس اعتبار سے مزید اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کہ اس کی اختتامی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ حضرت ملا شاہ قادری کی مرید بھی ہوگئی تھیں۔ چنانچہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے فوراً بعد ہی ملا شاہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں:

''الحقیر فقیر یست کہ از برکت پیر دستگیر حضرت خواجہ معین الملۃ والدین وازتوجہ ظاہر و باطن مرشد حقیقی حضرت مولانا ی شاہ مدظلہ والفاہ در حقیقت الحقایق ہست کہ ہستی موہومی رفتہ و ہستی آں نیست بی زوال ماندہ''۔(۲۷)

بحیثیت مجموعی یہ کتاب شاہ جہانی عہد کی متصوفانہ کتب میں اہم مقام کی حامل ہے اور اس لحاظ سے اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کہ اس میں شاہی خاندان کی علمی روایت کی جھلک ذاتی حوالے سے نظر آتی ہے۔ بظاہر جہاں آرا بیگم کی یہ پہلی تصنیف ہے، لیکن زبان پختہ و شگفتہ اور انداز بیان تخلیقی و فنکارانہ ہے۔ مصنفہ نے ہر جگہ اپنی بات کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے اور اپنے اعتقادات کو محکم طریقے سے بیان کیا ہے۔

جہاں آرا بیگم کو زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل ہے۔ ان کا اسلوب دلکشی و رعنائی سے بھرپور ہے۔ اگرچہ موضوع کی مناسبت سے لہجہ میں تواضع و انکسار سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جملوں میں شاہانہ شکوہ بھی کہیں کہیں ابھر آیا ہے جو شخصیت کے پر جلال ہونے کی بھی

غمازی کرتا ہے۔عمومی انداز سادہ مگر تحقیقی ہے۔روانی عبارت کا خاص خیال رکھا ہے۔الفاظ کی دروبست، واقعات کے انتخاب، لہجے کی سادگی اور دل نشیں انداز نے کتاب کو پرکشش وموثر بنادیا ہےاور یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ فارسی زبان کے علمی وادبی اور متصوفانہ سرمایے میں عمومی طور پر اور نسائی ادب میں بالخصوص یہ کتاب نہایت وقعت کی حامل ہے۔

حواشی

(۱) محمد صالح کنبو، عمل صالح، ایشیا ٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۹۲۷ء، ج ۱، ص ۳۵۔ (۲) عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، کالج پریس، ۱۸۶۷ء، ج ۱، حصہ ۱، ص ۳۹۱۔ (۳) محمد صالح کنبو، عمل صالح، ج ۱، ص ۱۹۲۔ عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، کالج پریس، ۱۸۶۷ء، ج ۱، حصہ ۱، ص ۳۹۱۔ (۴) عبدالحئی حسنی، نزہتہ الخواطر وبہجتہ المسامع والنواظر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۷۶ء، ج ۵، ص ۱۲۵۔ (۵) غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۰ء، ج ۲، ص ۹۱-۹۲۔ (۶) محمد صالح کنبو، عمل صالح، ج ۱، ص ۱۹۲۔ ومنتخب اللباب، ج ۱، ص ۴۰۰۔ (۷) عبدالحئی حسنی، نزہتہ الخواطر، ج ۵، ص ۱۲۵۔ (۸) علی الدین بن خیرالدین مفتی لاہوری، عبرت نامہ، پنجاب ادبی اکادمی، لاہور، ۱۹۶۱ء، ج ۱، ص ۶۶۔ (۹) عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، ج ۱، حصہ ۲، ص ۲۵۲۔ (۱۰) اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۶ء، ج ۷، ص ۵۴۶۔ (۱۱) Persian Literature, C.A. Story, London 1953, V:1 Part:2, P.1000-1001۔ (۱۲) جہاں آرا بیگم، مونس الارواح، قلمی نسخہ یونیورسٹی نمبر ۸۰، ورق ۱۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) ایضاً، ورق ۳۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) ایضاً، عبدالسلام نمبر ۹۴۳/ ۳۸، ورق ۵۔ (۱۷) ایضاً، ورق ۷۔ (۱۸) ایضاً۔ (۱۹) ایضاً۔ (۲۰) ایضاً، ورق ۴۰۔ (۲۱) ایضاً، ورق ۴۲۔ (۲۲) ایضاً، ورق ۴۰۔ (۲۳) ایضاً، ورق ۵۱۔ (۲۴) ایضاً، ورق ۵۶۔ (۲۵) جہاں آرا بیگم، مونس الارواح، قلمی نسخہ عبدالسلام نمبر ۹۴۳/ ۳۸، ورق ۶۵۔ (۲۶) ایضاً، ورق ۷۹۔ (۲۷) جہاں آرا بیگم، مونس الارواح، قلمی نسخہ یونیورسٹی نمبر ۸۰، ورق ۴۶۔

کوپرنیکس اور حرکت زمینی کا نظریہ

پروفیسر مقصود احمد

کوپرنیکس (Copernicus) کی پیدائش پولینڈ کے شہر Torun میں ۱۹/فروری ۱۴۷۳ء کو ہوئی۔ اس نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۴۹۱ء میں University of Cracow سے وابستہ ہوگیا، جہاں ۱۴۹۴ء تک حصول علم میں سرگرداں رہا۔ پھر مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ۱۴۹۷ء میں اٹلی گیا اور وہاں کی کئی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا۔ ان میں سے تین کے نام یہ ہیں University of Bologna، University of Padua اور University of Ferrara۔ دوران قیام اٹلی اس نے کچھ دنوں تک درس و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ۱۵۰۰ء میں اس نے روم میں علم ہیئت (Astronomy) اور علم حساب (Mathematics) پر لکچرز دیے، جن کی کافی پذیرائی ہوئی۔

اٹلی میں اسے عربی علوم وفنون سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی ملا۔ اس کے شواہد اس کی مشہور زمانہ تصنیف میں موجود ہیں اور اس کا باقاعدہ ذکر آگے آرہا ہے۔

اٹلی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۵۰۵ء یا ۱۵۰۶ء میں اس نے اپنے وطن کا رخ کیا اور Heilsberg میں مقیم ہوگیا۔ تقریباً چھ سال کے بعد یعنی ۱۵۱۲ء میں اس نے Fraunberg کے لیے رخت سفر باندھا اور بالآخر وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔

۱۵۱۲ء ہی میں اس نے ایک رسالہ بعنوان "Commentariolus" لکھا، جو علم ہیئت (Astronomy) سے متعلق اس کے خیالات ونظریات کی مختصر توضیح و تصریح پر مبنی تھا۔ متوقع شدید اور معاندانہ ردعمل کے پیش نظر اس نے اس پر اپنا نام تحریر کرنے سے احتراز کیا اور اسے

پروفیسر آف عربک وصدر، شعبۂ فارسی، عربی و اردو، بڑودہ یونیورسٹی، بڑودہ۔

بے نام و بے پتہ اپنے دوستوں اور بہی خواہوں میں خفیہ طور پر تقسیم کر دیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد راز فاش ہوگیا۔ شروع میں اس کو تشویش ضرور ہوئی، مگر دوستوں کی حوصلہ افزائی کے طفیل، وہ جلد ہی کافور ہوگئی۔ چنانچہ تمام اندیشہ ہائے دور دراز کو بالائے طاق رکھ کر وہ اپنے تحقیقی کام میں عزم و ہمت کے ساتھ مشغول ہوگیا اور ۱۵۳۰ء میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ پھر دوستوں کے پیہم اصرار پر وہ اپنے ۴۰۰ صفحات پر مشتمل کارنامے کو منظر عام پر لانے کے لیے رضامند ہوگیا لیکن اس کے باوجود احتیاطاً اس کی باقاعدہ اشاعت سے پہلے اس کے شاگرد خاص Rheticus نے لوگوں کے تاثرات معلوم کرنے کے لیے اس کا ایک خلاصہ جاری کیا۔ خوش قسمتی سے اس پر کسی قسم کے مخالفانہ ردعمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اس سے کوپرنیکس کی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے اپنے تحقیقی کارنامے کی طباعت و اشاعت کی باقاعدہ منظوری دے دی۔ اس طرح 'کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے'۔

اس کا یہ کارنامہ De Revolutionibus Orbiun Coelestium (TheRevolutions of Celestial Spheres) کے عنوان سے ۱۵۴۳ء میں Nuremberg سے انطباع پذیر ہوا اور اس کی پہلی کاپی اس کو اس وقت ملی جب وہ بستر مرگ پر دراز تھا۔ اس کے دیدار سے اس نے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا اور اس کے بعد انہیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیا۔ یہ سانحہ ۲۴ رمئی ۱۵۴۳ء کو پیش آیا۔ (۱)

بقول Hitti کوپرنیکس کی مذکورہ بالا کتاب میں دو مشہور و معروف مسلم ہیئت دانوں البتّانی (Albategnius، م ۹۲۹ء) اور الزرقالی (Arzached، م ۱۰۸۷ء) کا حوالہ موجود ہے۔ (دیکھیے History of the Arabs، لندن، ۱۹۷۲ء، ص ۵۷۲) اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اپنے قیام اٹلی کے دوران اس نے عربی علوم و فنون سے متعلق اہم کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور بعد میں ان سے بھرپور استفادہ بھی کیا۔

اسکندریہ کے بطلیموس (Ptolemy، صاحب Almagest، جس کا تعلق دوسری صدی عیسوی سے تھا) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کرۂ زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج، چاند اور دیگر تمام اجرام فلکی اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس نظریے کو پندرہویں صدی عیسوی تک

مقبولیت حاصل رہی ۔ پھر کوپرنیکس (۱۴۷۳ء-۱۵۴۳ء) نے بہ شمول زمین تمام سیاروں کو سورج کے گرد گردش کرتے ہوئے بتایا۔ یہ صحیح ہے کہ کوپرنیکس نے مذکورہ نظریے کو پندرہویں صدی میں بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کیا۔ مگر اس کو اس کا بانی تصور کرنا درست نہیں ہے۔ کوپرنیکس سے بہت پہلے ابوسعید نے بطلیموس کے مفروضے پر ضرب لگائی تھی اور کرۂ ارض کو جامد کے بجائے متحرک قرار دیا تھا۔ البیرونی (۹۷۳ء-۱۰۵۰/۵۱ء) نے بھی اس کے اس انقلاب انگیز نظریے کی تائید دبے لفظوں میں کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی قابل قدر تصنیف ''کتاب فی استیعاب الوجوہ الممکنة فی صنعة الاصطرلاب'' میں لکھتا ہے:

''ابوسعید نے ایک بڑا اصطرلاب (Astrolabe) بنایا تھا، جس کا عمل مجھ کو بہت پسند آیا اور میں نے ابوسعید کی بہت تعریف کی، کیونکہ جن اصولوں پر اس نے اس کو قرار دیا تھا وہ کرۂ ارض کو متحرک تسلیم کرتے ہیں۔ میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ عقیدہ ایسے شبہ کی حالت میں ہے کہ اس کا حل کرنا نہایت دشوار اور اس کا رد کرنا نہایت مشکل ہے۔ مہندسین اور علمائے ہیئت اس عقدے میں بہت پریشان ہوں گے''۔ (سید حسن برنی، البیرونی، ص ۲۱۰-۲۱۱، بحوالۂ حالات ابوریحان بیرونی از مولوی عنایت اللہ، ماخوذ از ابوریحان البیرونی از ضیاء الحسن فاروقی، مشمولہ البیرونی اور جغرافیہ عالم از مولانا ابوالکلام آزاد، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۶-۲۷)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فاروقی صاحب فرماتے ہیں: ''اگر اہل یورپ حرکت زمینی سے متعلق (ابوسعید اور) البیرونی کے خیالات سے واقف ہوتے تو شاید وہ بطلیموس کے موقف کو حرفِ آخر نہ تصور کرتے اور کوپرنیکس سے بہت پہلے یہ ثابت ہو جاتا کہ زمین متحرک ہے''۔ (ابوریحان البیرونی مشمولۂ البیرونی اور جغرافیۂ عالم، ص ۲۷)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل یورپ کو اس سے واقفیت رہی ہو مگر اس حقیقت کو انہوں نے مجذوب کی بڑ تصور کیا ہو اور اس پر مزید تحقیقی کام کرنے کو کارِ لاحاصل سمجھا ہو۔ بہر حال صورت حال جو بھی رہی ہو، لیکن اب یہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس نظریے کا اصل موجد کوپرنیکس نہیں بلکہ ابوسعید ہے۔ جہاں تک کوپرنیکس کا تعلق ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس کو کسی عربی تصنیف سے اچک لیا اور اس میں کچھ رنگ آمیزی کر کے اسے اپنا ذاتی نظریہ قرار دے دیا۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، کوپرنیکس کی پیدائش اور نشو ونما اگرچہ Poland میں ہوئی، مگر اعلیٰ تعلیم کے لیے اس نے اٹلی کا رخ کیا اور ۱۵۰۵ء یا ۱۵۰۶ء تک وہاں کی متعدد یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جامعات اٹلی کے نصابات میں عربی علوم وفنون کا مطالعہ شامل تھا۔ لہٰذا گمان غالب ہے کہ اٹلی ہی کی کسی یونیورسٹی میں کوپرنیکس کو زیر تذکرہ نظریے سے کسی نہ کسی شکل میں آ گاہی حاصل ہوئی ہوگی اور اس نے اعتراف حقیقت اور اظہار ممنونیت کے بغیر بلا تامل اسے اپنی طرف منسوب کرکے ''جدید علم ہیئت کا بانی Founder of Modern Astronomy'' کا خطاب حاصل کرلیا۔

حواشی

(۱) کوپرنیکس کے حالات زندگی درج ذیل کتب سے ماخوذ ہیں:

1- The New Encyclopaedia Britannica, Vol.3, 1997, P.610.

2- The Encyclopaedia Americana, Vol.7, 1984, P.755-756.

3- Colliers Encyclopaedia, Vol.7, 1977, P.302.

4- The Columbia Encyclopaedia, Vol.1, 1965, P.486.

5- The New Illustrated Everyman's Encyclopaedia, Vol.2, 1984, P.393.

6- The Cambrigde paperback Encyclopaedia Delhi, 2000, P.211.

(۲) عربی میں یہ کتاب ''المجسطی'' کے نام سے مشہور ہے۔ مجسطی یونانی لفظ "Magiste" بہ معنی عظیم ترین کی تعریب ہے، جس پر عربی قواعد کے مطابق اَلْ داخل کردیا گیا ہے۔ بعد میں یہی لفظ انگریزی میں Almagest ہوگیا، جو آج تک رائج ہے۔

اخبار علمیہ

''پاکستان میں شبلی کالج کے بانی کی قرآنی خدمات''

علامہ شبلی نعمانی کی بے مثال شخصیت اور ان کے افکار و خیالات کو مرکز عقیدت بنانے والوں میں ایک پاکستان کے حافظ نذر احمد صاحب تھے، جن کی پوری زندگی اسلام کی خدمت اور علوم قرآنی کی اشاعت کے لیے وقف رہی۔ اگست ۲۰۱۱ء میں ان کے انتقال پر پروفیسر ڈاکٹر مزمل احسن شیخ نے لکھا کہ حافظ صاحب نے ۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے فوراً بعد چوک گھڑی شاہو، لاہور میں علامہ شبلی سے موسوم ''شبلی کالج'' قائم کیا تا کہ کالج کی تعلیم و تربیت پر علامہ شبلی کے نظریات سایہ فگن رہیں۔ اس کالج کے بے شمار فارغین اپنے اپنے دائرہ عمل میں نمایاں ہوئے اور اکثر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے، صبح و شام درس و تدریس کا اس کا نظم بھی دوسرے کالجوں سے جدا تھا، حافظ صاحب خود اچھے معلم و مدرس تھے۔ ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ طلبہ میں مسیحی مشنریاں بائبل تقسیم کر رہی ہیں اور مسیحیت کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں تو حافظ صاحب تڑپ اٹھے اور انہوں نے جمیعت تعلیم القرآن ٹرسٹ کراچی میں قائم اور تعلیم القرآن کو بڑی عمدگی سے مرتب کیا، اور بڑے حکیمانہ انداز میں اسلام کیا ہے؟ اسلام کیا چاہتا ہے؟ اسلامی آداب، اسلام نظام عدل و تعزیرات اور انبیائے قرآن جیسے موضوعات پر مکمل نصاب پیش کر دیا ہے، یہ پانچوں کورس دس اسباق پر مشتمل ہیں ان کو بعد میں سندھی زبان میں بھی منتقل کیا گیا، پہلے دو کورس انگریزی میں بھی تیار کیے گئے، ایک اور جدت یہ ہوئی کہ قیدیوں کے لیے بھی یہ نصاب منظور کرایا گیا اور کورس کی تکمیل کے بعد ان قیدیوں کی سزا میں ۱۵ دن سے چھ ماہ تک کی تخفیف کی سہولت دی گئی۔ ناظرہ قرآن کی تکمیل پر تین ماہ کی معافی کی سہولت اب تک بیس ہزار قیدی حاصل کر چکے ہیں، اسی طرح آسان ترجمہ قرآن کریم مکمل کرنے پر ۱۱۳۶ قیدیوں کی سزا میں چھ ماہ اور حفظ قرآن پر ۱۴۸ قیدیوں کی سزا میں دو سال کی کمی کی گئی ہے۔ ادارے کے ریکارڈ کے مطابق پہلے کورس سے ۵ لاکھ تیس ہزار، دوسرے سے ایک لاکھ تیس ہزار، تیسرے سے ۳۵ ہزار ۵ سو، چوتھے سے ۲۳ ہزار اور پانچویں سے ۱۵ ہزار ۵ سو افراد نے فیضیاب ہو کر سندیں حاصل کیں۔ ۱۹۷۵ء سے اب تک سندھی اور انگریزی کورسوں سے ۲۰ ہزار مسلم و غیر مسلم بہرہ ور ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ حافظ صاحب نے ''جائزہ مدارس عربیہ پاکستان، نامی کتاب ۱۹۶۱ء میں تصنیف کی، ان کی تصنیفی مساعی میں سیرت مبارکہ کے چند پہلو، طب نبویؐ، اشاریہ تفسیر ماجدی، فرہنگ عصریہ، پیارے نبیؐ کی پیاری زبان اور قرآنی موضوعات پر متعدد کتابیں شامل ہیں، انہوں نے

مقالات یوم شبلی بھی مرتب کی۔(اردو ڈائجسٹ/http://urdudigest.PK)

"سعودی عرب میں طلاق کے ۱۳۷۱ معاملات"

عربی روزنامہ "الاقتصادیہ" کے مطابق سعودی سرکاری محکموں نے ۱۴۳۴ھ کے آغاز سے سال رواں کے ماہ ربیع الاول تک ۱۳۷۱ طلاق کے ایسے قضیے درج کیے ہیں جن کی اہم وجہ "عدم معاشرہ جنسیہ" یعنی جنسی عدم تسکین بتائی گئی ہے، گذشتہ سال یہ تعداد ۲۸۱۳ تھی، رپورٹ کے مطابق مکہ میں شوہر کے خلاف ۴۳۹ اور بیوی کے خلاف ٦٦، اسی ترتیب سے ریاض میں ۳۵۵ اور ۵۳، مشرقی علاقہ میں ۲۱۹ اور ٦۰، جازان میں ۹۲ اور ۲۵ اور القصیم میں ۴۵ اور ۱۴ مقدمے قائم کیے گئے۔ یہ تعداد اس سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز بن محمد السدحان رکن هيئة التدريس في الكلية التقنية، ریاض نے ان اعداد و شمار پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ زوجین کے درمیان باہمی نااتفاقی کے متعدد اسباب میں نفسیاتی اور جسمانی کمزوری، بیماری یا طرفین میں ایک دوسرے کو ناپسند کرنا بھی ہوتا ہے، قاضی ان تمام وجھوں کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ متعلقہ محکموں کے پاس ایسے دسیوں معاملے بھی آئے جن کو خاندانی افراد سے مشورہ کر کے حل کیا گیا۔(وکالۃ الاخبار المجتمع السعودی، سینچر ۱۸/جنوری ۱۴ء)

"مجلّہ "روبان" کا اجراء"

بنگلہ دیش کی آبادی میں ۹۰ فیصد مسلمان ہیں لیکن شیطانی وطاغوتی قوتیں کس طرح اس ملک کی بربادی کے درپے ہیں اس کا اندازہ اس نہایت تکلیف دہ حقیقت سے کیا جاسکتا ہے جو ایک کویتی روزنامہ الانباء کے صفحات پر ظاہر ہوئی ہے، اس کے مطابق راجدھانی ڈھاکہ میں ہم جنس پرتوں نے حکومت کی بے جا مسامحت اور لچک کے سبب اپنے خیالات وجذبات کے اظہار و فروغ کے لیے پہلی بار "روبان" نامی ٥٦ صفحات پر مشتمل ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا ہے، اس کے اجراء کی تقریب میں بے راہ رو نفس پرستوں کے علاوہ حکومت اور حقوق انسانی کے بعض سرگرم افراد بھی موجود تھے، اس کے ایڈیٹر راسل احمد نے فرانس پریس کے نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ رسالہ ہمارے معاشرہ کے لیے ایک خوش آیند قدم ہے، ایک ۲۵/سالہ نوجوان نے بڑی بے شرمی سے کہا کہ یہ ملک ہم جیسے ہم جنس پرستوں اور ملک کے دوسرے لوگوں کے درمیان رواداری اور ایک دوسرے کے نظریات کا پاس ولحاظ رکھنے کی فضا کو استوار کرنے میں معاون و مساعد ہوگا اور ہم جنس پرستی کے مخالفین کی شدت میں ایک مثبت تبدیلی آئے گی۔(الانباء، کویت، ۲۱/جنوری ۲۰۱۴ء)

''خوابوں کی تعبیر پر حکم امتناعی''

اخبار ''الوطن'' کی ایک خبر کے مطابق سعودی عرب کی وزارت ثقافت واعلام نے ملک کے جرائد ورسائل کے لیے ایک ضابطہ اخلاق جاری کیا ہے کہ وہ ایسی خبریں یا اشتہارات شائع نہ کریں جن کا تعلق خواب اور اس کی تعبیر بیان کرنے والوں سے ہو، خوابوں کی تعبیر بتانے والوں کے کاروبار پر قدغن لگانے کے لیے یہ حکم بھی دیا گیا کہ ان کے نام پتے اور فون نمبر وغیرہ نہ شائع کیے جائیں، اسلام میں خوابوں کی بنیاد پر حقائق کی عمارتیں نہیں قائم کی جاسکتیں، اس ضعیف الاعتقادی سے معاشرہ پر منفی اثر پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل اور قضاوقدر پر ایمان میں کمی آتی ہے۔ وزارت نے دینی تنظیموں اور رہنماؤں سے درخواست کی ہے کہ وہ قرآن وسنت اور مستند فتاوی کی روشنی میں عوام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔ (وکالۃ الاخبار المجتمع السعودی، ۱۵/جنوری ۱۴ء۔ http:/wwwnews_sa.com)

''معارف سے استفادہ کی سہولت''

ناظم دارالمصنّفین کی درخواست پر ''ڈبلیوڈبلیو بھٹکلیز ڈاٹ کام'' کے ڈائریکٹر نے معارف کی سو سالہ فائل پر مشتمل سی ڈی سے استفادہ کی سہولت کے لیے اکرومیٹ فورمیٹ شکل میں ایک الکٹرانک کتاب تیار کردی ہے، ان کے بیان کے مطابق پوری فائل کمپیوٹر یا ہارڈ ڈسک کے مخصوص فولڈر میں محفوظ کرنے کے بعد اپنے کمپیوٹر پر AVAFINP یا Everything جیسے کسی تحقیقی سافٹ ویر لوڈ کر کے اس کے اسی سافٹ ویر کے ذریعہ مہینہ، سال، شمارہ، مضمون اور صفحہ کو بآسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب بھٹکلیز ڈاٹ کام پر موجود ہے۔ اس سے استفادہ کرنے والوں کے لیے شروع میں اس کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔

''مسلم بچیوں کو ہنرمند بنانے کا سرکاری منصوبہ''

وزارت فروغ انسانی وسائل نے مسلم لڑکیوں کو ہنرمند بنانے کے لیے ۹۷۸ کروڑ روپے پر مشتمل خصوصی اسکیم تیار کی ہے جس کا مقصد مسلم لڑکیوں کو روزگار فراہم کرتے ہوئے انہیں خودکفیل بنانا اور اسکول کو جلدی خیرباد کہنے والی لڑکیوں کو تعلیم مکمل کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس اسکیم کا نام ''ہنر'' رکھا گیا ہے، پہلے مرحلہ میں اترپردیش، مغربی بنگال، جھارکھنڈ، آندھراپردیش، بہار اور آسام میں ۵۰ ہزار مسلم لڑکیوں کو ووکیشنل کورسز کی ٹریننگ فراہم کی جائے گی، ہر کورس ۶ ماہ پر مشتمل ہوگا۔ اس میں داخلہ کے لیے ان کی ذہنی لیاقت وصلاحیت اور شوق وذوق کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے گا۔ (اخبار منصف، حیدرآباد، ۲/جنوری ۱۴ء)　　　ک ،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

قتل عمد، اصلاح و تصحیح

تغلق آباد، نئی دہلی

۱۱ر جنوری ۲۰۱۴ء

مکرمی! سلام مسنون

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرا مضمون ''قتل عمد میں قصاص اور دیت ہے، معافی نہیں'' شائع فرمایا۔اس خط کے لکھنے کی غرض مطبوعہ مضمون کے ایک حوالے کی اصلاح اور ایک ناتمام حوالے کو مکمل کرنا ہے۔میں نے بخاری کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی تھی: **یا ایھا الناس، انی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعده ان اعتصمتم به ، کتاب الله** ۔لیکن یہ حدیث صحیح بخاری کے بجائے صحیح مسلم کی ہے اور اس میں ''**یا ایھا الناس ، انی** '' کا فقرہ نہیں ہے۔حدیث اس طرح ہے:**قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعده ان اعتصمتم به ، کتاب الله** (صحیح مسلم، **کتاب الحج ، باب حجة النبی صلی الله علیه وسلم ،** حدیث نمبر ۱۲۱۸)۔

یہ حدیث دراصل اس بصیرت افروز خطبے کا آخری حصہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات (وادی عرفہ) میں دیا تھا۔

اسی مضمون سے متعلق ایک دوسرا حوالہ ''المعجم الکبیر'' (امام طبرانی) کا دیا گیا ہے۔اس روایت میں کتاب اللہ کے ساتھ ''عترتی اہل بیتی'' کے الفاظ بھی ہیں، جو ظاہر ہے کہ راوی کا اضافہ ہے۔اس حدیث کا مکمل حوالہ ہے: المعجم الکبیر، ج ۳، ص ۶۶ (حدیث نمبر ۲۶۸)۔

خاکسار

الطاف احمد اعظمی

بریلی میں اردو شاعری

۵۸، نیو آزاد پرم کالونی،
عزت نگر، بریلی، یوپی
۲۰۱۴/۱/۱۲ء

بریلی میں اردو شاعری کا ظہور وشیوع ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کے تحقیقی مطالعے کا خصوصی موضوع ہے۔ جگر بریلوی - ایک تعارف (علی گڑھ ۱۹۷۳ء) چند شعرائے بریلی (لکھنؤ ۱۹۷۶ء) نعت گویان بریلی (دہلی ۱۹۸۶ء) اسی سلسلے کی کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر ادیب نے تقریباً ۳۵ برس کی محنت شاقہ کے بعد بریلی کے شعراء کا تذکرہ باسم ''تذکرہ شعرائے بریلی'' تالیف کیا ہے، جو غیر مطبوعہ ہے اور راقم الحروف کی تحویل میں ہے۔ یہ تذکرہ دوسو برس کی مدت (۱۷۴۹ تا ۱۹۴۹ء) کو محیط ہے۔ جدید تحقیقی ذرائع اور طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے قدیم تذکرہ نگاری کی روایت اور اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے آج کے دور میں تذکرہ تالیف کرنا ایک خوش گوار تجربہ ہے۔ مولف ۲۸/نومبر ۱۹۹۱ء کو اس تذکرے کی تکمیل کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۱ء سے آج تک یہ تذکرہ منتظر اشاعت ہے۔ تذکرے کی ضخامت ڈیمائی سائز کے تقریباً ۵۵۰ صفحات کو محیط ہوگی۔ ضخامت کے سبب ہی اس کی اشاعت کی بہ ظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سر دست اس کا مقدمہ ''معارف'' کی نذر ہے تاکہ تذکرے میں پیش کردہ مواد کی قدر و قیمت کا قدرے اندازہ لگایا جا سکے۔

اردو کے اشاعتی ادارے مثلاً قومی کونسل برائے فروغ اردو (دہلی) یا یوپی اردو اکیڈمی (لکھنؤ) اپنے اشاعتی منصوبے میں اگر اس تذکرے کو شامل کر لیتے ہیں تو مولف کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔

شمس بدایونی

آثار علمیہ و تاریخیہ

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک عربی مکتوب بنام استاذ محبّ الدین الخطیب مصری

''علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ایک عربی مکتوب اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے نام خط کا یہ تحفہ عزیز مکرم مولوی طلحہ نعمت ندوی کی معارف نوازی کا نتیجہ ہے، جس کے لیے معارف ان کا ممنون ہے''۔ (معارف)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے قدر دانوں میں ایک نمایاں نام مصر کے نامور صاحب قلم استاذ محبّ الدین الخطیب ایڈیٹر مجلّہ ''الفتح''، مصر کا ہے، البعث الاسلامی رجب ۱۴۰۰ھ کے شمارہ میں مشہور مصری ادیب جناب انور الجندی کا مضمون بعنوان ''**ندوۃ العلماء و أثرھا**'' شائع ہوا تھا جس میں موصوف نے حضرت سید صاحبؒ سے شیخ محبّ الدین الخطیب کے مراسم کا تذکرہ کرتے ہوئے سید صاحب کی شان میں ان کے توصیفی کلمات اور اس کے بعد ان کے نام سید صاحب کے ایک مکتوب کا اقتباس نقل کیا ہے، استاذ محبّ الدین لکھتے ہیں:

> ''علامہ ندوی کا شمار اسلامی ہند کی عظیم المرتبت شخصیات میں ہوتا ہے، اگر مسلمانان ہند اپنے مفاخر اور کارنامے شمار کریں تو سید صاحب کا اسم گرامی سرفہرست ہوگا، ان کی عظمت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج ان کے سینکڑوں نہیں ہزاروں شاگرد مختلف گوشوں میں علم و دین کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں، یقیناً اس کا سہرا سید صاحب ہی کے سر بندھے گا، اپنے شاگردوں کی ان خدمات کو دیکھ کر سید صاحب کی آنکھیں ٹھنڈی ہو رہی ہوں گی''۔

استاذ محبّ الدین الخطیب نے یہ الفاظ سید صاحب کی حیات ہی میں غالباً اپنے مجلّہ الفتح میں لکھے تھے، ان الفاظ سے سید صاحب سے ان کی عقیدت و محبت نمایاں ہے، سید صاحب اور ان کے درمیان مراسلات کا سلسلہ جاری تھا، دارالمصنّفین کی اکثر عربی کتابیں مصر سے انہیں

کے زیر اہتمام ان کے مطبع المطبعۃ السلفیۃ میں شائع ہوئیں، انہیں کی درخواست پر سید صاحب نے خطبات مدراس کا ترجمہ اپنے شاگرد مولانا محمد ناظم صاحب ندوی سے کروا کر اشاعت کے لیے انہیں دیا تھا جو ان کے مقدمہ کے ساتھ مطبع مذکور سے شائع ہوئی، انہوں نے مقدمہ میں یہ تمام تفصیلات ذکر کی ہیں، نیز اپنے مراکش کے دوران قیام جب وہ وہاں سے مجلّہ ''الزہراء'' نکال رہے تھے سید صاحب کی کتاب ''سیرت عائشہ'' (غالباً اس کا ترکی ترجمہ دیکھ کر، کیونکہ وہ اردو نہیں جانتے اور کتاب اس وقت عربی میں بھی نہیں آئی تھی) پر مفصل تبصرہ لکھا تھا، اور مصنف کی تحقیقی کوشش کی دل کھول کر داد دی تھی۔

اس کے بعد سید صاحب کے خط کا اقتباس (عربی متن مع ترجمہ) پیش کیا جاتا ہے کہ قارئین سید صاحب کے عربی اسلوب تحریر کا بھی لطف لے سکیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"انی وان حرمت مبادلتكم الكتب منذ سنوات ، ولكن حبكم راسخة جذوره فی قلبی ، وما يجود به قلمكم مرفوعاً و صدىٰ دعوتكم فی أصقاع الأرض مسموعاً ، أهنئكم أنكم أعدتم ما كان لمصر من المكانة فی قلوب المسلمين، وكادت أن تضيع بين المؤيد واللواء ، ولكم يد بيضاء فی تعارف الأمم الاسلامية وتعانقها ، وقد كانت أصبحت شجرة ممنوعة لبنی آدم ، وكادت أن تنسخ شريعة الجنسيات الكاذبة شريعته و تضلل طريقته" ۔

گرچہ میں کئی سالوں سے آپ سے کتابوں کے تبادلہ سے محروم ہوں، لیکن دل آپ کی محبت سے معمور ہے اور ہر ہفتہ آپ کی نگارشات دیکھ کر نیز آپ کے مجلّہ میں آپ کی تحریریں پڑھ کر یہ محبت اور بڑھتی جارہی ہے، آپ کا اشہب قلم مسلسل جولانی دکھا رہا ہے اور آپ کے پیغام اور فکر کو مقبولیت حاصل ہورہی ہے، میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے مصر کی کھوئی ہوئی عظمت جو اللواء اور المؤید جیسے رسالوں کے ذریعہ مسلمانوں کے دلوں سے نکل گئی تھی دوبارہ بحال کی، ملت اسلامیہ کے باہمی تعارف اور آپس میں ایک دوسرے کو قریب کرنے میں بھی آپ نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، حالانکہ جنگ عظیم کے بعد یہ انسانوں کے لیے شجر ممنوعہ سمجھی جانے لگی تھی اور خطرہ تھا کہ جھوٹی اور نام نہاد قومیتوں کے نعروں میں گم ہو کر اس کا خاتمہ ہوجائے۔

مکتوب سلیمانی بنام مولانا گیلانیؒ

حبیب مکرم

عفاک عنک وسلم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، والا نامہ صادر ہوا، خدا کا شکر ہے کہ آپ دکن سے وطن کی سمت روانہ ہوگئے، اللہ تعالیٰ آپ سے دین وملت کی مزید اور تادیر خدمت لے۔

میں ادھر ۱۵/اپریل کو علی گڑھ اور دہلی گیا تھا، چار روز میں واپس آ گیا، تقریب سفر حضرت خواجہ صاحب اجمیری کی درگاہ شریف کی سرکاری کمیٹی میں جبری شہادت کی ادائی تھی، میں نے عذر کیا تھا مگر عذر مسموع نہ ہوا، ناچار دہلی کا سفر کیا اور یہاں تک پہنچ کر یونیورسٹی کے کورٹ کے جلسہ میں شرکت کے لیے علی گڑھ بھی ہو آیا۔ علی گڑھ میں مولوی فضل صاحب سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے یہ خبر دی کہ آپ اپنے نادیدہ پوتوں کے دیدار کے لیے ڈھاکہ گئے ہیں، شروانی صاحب سے ملاقات ہوئی، افسوس کہ تیر کا سا قد بالا اب کمان ہو گیا۔ حتی عاد کالعرجون القدیم، حافظہ بہت ضعیف ہو گیا ہے تاہم آن بان وہی ہے، ایسے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔

دہلی ۲۴/اگست ۴۷ء کے بعد اب دیکھی، مجھے تو بالکل بے رونق ہوگئی۔ مسلمان تو مسلمان پناہ گزیں بھی بری حالت میں ہیں، یہ دلی کی گرمی اور وہ سڑکوں پر کپڑا، ٹاٹ تان کر یا لکڑی یا ٹین کی چادر ڈال کر بسر کر رہے ہیں۔

میں نے آپ کے متعلق علی گڑھ میں پھر زور ڈالا، تو بجٹ کی کمی کا بظاہر عذر کیا، مگر مجھے اندازہ ہوا کہ آپ کے متعلق کسی حیدرآبادی نے بالکل غلط بات کہہ دی ہے کہ معاملات میں گڑبڑ کرتے ہیں ہر چند میں نے تردید کی مگر............ کی روایت کے آگے میری شہادت کام نہیں آئی۔ ڈاکٹر رضی الدین بھی سنا ہے کہ علی گڑھ بلائے جا رہے ہیں۔

اتفاق دیکھئے کہ بھوپال لوٹا تو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر کا خط ملا کہ شعبۂ اسلامیات کے لیے ایک پروفیسر ۸۰۰-۱۲۰۰/اور ایک سینئر لکچرر ۳۰۰-۵ چاہیے اور خط کے آخر میں مجھے کنایۃً دعوت دی گئی تھی، میں نے پھر بڑے زور سے وہاں آپ کا نام لکھا ہے اور گیلانی کا

پتہ دے دیا ہے۔اب دیکھئے وہ کیا کرتے ہیں۔

آپ نے خط میں جس استغنا کا ذکر کیا ہے وہی صحیح ہے۔ضرورت ایسے لوگوں کی ہے جو بہار کے مسلمانوں کی خدمت کرسکیں اوران میں دین کی دعوت کو پھیلاسکیں۔

ادھر میرے بہار آنے کی ایک شکل نکل آئی، مدرسہ شمس الہدیٰ کی پرنسپلی کا دوبارہ انتخاب ۱۶رمئی کورانچی میں ہورہا ہے، مجھے مشورہ کے لیے بلایا گیا ہے،اس بہانہ سے میں نے وطن کا قصد کیا ہےاورایک ماہ سے زائد کی رخصت کی استدعا کی ہے۔

معلوم نہیں آموں کا کیا حال ہے، میرا باغ تو تباہ ہوگیا ہے،گھر کے پروردہ کہاں گئے۔ اس پرسرکار میں ملکیت کا دعویٰ کیا ہے،ایک سال سے مقدمہ چل رہا ہے۔نتیجہ نامعلوم۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے حیدرآباد کی رقم جاری کرادی، چنانچہ ایک ہفتہ ہوا، گذشتہ چھ مہینہ کی رقم وصول ہوگئی، ماجد میاں نے مولوی ابوالکلام صاحب کولکھا تھااورانہوں نے چودھری کولکھا،شاید یہی سبب ہو یامحض فضل الٰہی۔البتہ اب تواس کا بھی یقین نہیں کہ آیندہ ریاست کی تشکیل کے بعد یہ امدادیں جاری بھی رہیں گی یانہیں۔

نواب صاحب بھوپال بہت بیمار ہیں، پتّے میں پتھری کا گمان ہے،روزانتظاررہتا ہے کہ آیندہ ریاست کی جوشکل ہونے والی ہے وہ سامنے آجائے۔

برادرم ابوالمکارم کوسلام کہہ دیجئے۔داروغہ ظفر ڈورانوں کا پرسوں نرسوں فالج میں یہاں انتقال ہوگیا۔دیسنہ میں میری تین عزیز بوڑھیوں نے وفات پائی۔

والسلام

سیدسلیمان

۳۰ راپریل ۱۹۴۹ء

ادبیات

حمد

کوثر اعظمی

سزاوارِ بہر توصیف تو یا ربنا الاعلیٰ　　کہ ہستی برتر از ہر کس و بالاتر زیر بالا
ہمہ عالم بُریٰ ما ما وراء اعجازِ تکوینت　　توئی خالق، توئی مالک، توئی حاکم، توئی مولا
نگہبانِ جہانستی و ہرچہ دو جہاں پیدا　　بہ از خار و خزف تا مہر و ماہِ احقر و اعلا
توئی در چین سیمائے ثریا آشکار ہستی　　توئی رمزیست غلطیدہ بنازِ غمزۂ شہلا
صدفہائے کہ غلطیدہ در آب و گل تہِ قلزم　　بہ از آغوشش تیرہ نمائی لؤلؤِ اجلیٰ
بفیضِ پرتوِ تو عالم آرا انجمستانست　　چمن اندر چمن روشن بتو شمعِ گل و لالہ
نشاطِ سرخوشی بخشی و سوزِ آرزو مندی　　بہ از خندہ لبی گل را و بلبل را بہ از نالہ
کمالِ حسنِ تقویمت وجودم صورتِ آدم　　وبعدش بر سبے خلقت لقد فضلتنی فضلا

وجز تو داورا کوثر نہ از غیرے ولا دارد
کہ ہستی تو مراد او رضایت غایتش اولیٰ

نعت ؐ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

نمودم سفر با خیالِ رسول ؐ　　بہ گیتی ندیدم مثالِ رسول ؐ
اگر پرسی از من کہ قرآن چیست　　کلامِ خدا ، در مقالِ رسول ؐ
نگاھم ، نثارِ نگاھی کہ دید　　رخ و روضۂ باجمالِ رسول ؐ
شود کاشکی سرمۂ چشمِ من　　غباری کہ شد پای مالِ رسول ؐ
زھی لطفِ عامی کہ بدخواہ ھم　　نہ محروم شد از نوالِ رسول ؐ
کمالش چہ آید بہ ادراکِ ما　　نظر خیرہ ، پیشِ جمالِ رسول ؐ
کجایید ، تاریخ خوانانِ دہر؟　　ز قرآن پرسید حالِ رسول ؐ

رسد کاش در روزِ محشر رئیس
لبم تا بہ خاکِ نعالِ رسول ؐ

☆ کوثر پریس، سرائے میر، اعظم گڑھ۔

☆☆ گوشۂ مطالعات فارسی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

حیات نعمانی (سوانح حیات حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ): از مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۶۹۲، قیمت: ۴۵۰ روپے، پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد، لکھنؤ، یوپی ۔

گذشتہ عیسوی صدی کے اواخر میں مولانا محمد منظور نعمانی کا انتقال ہوا تو ماتم کرنے والوں نے ان کا شماران خال خال لوگوں میں کیا جن کے مقدر میں اشک سحر گاہی سے وضو کرنے کی سعادت ودیعت کی گئی تھی۔ بیسویں صدی خصوصاً اس کے نصف آخر میں مولانا مرحوم ان چند ہستیوں میں تھے جو ملک وملت کے ہر محاذ پر سرگرم و متحرک ہی نہیں بے چین، مضطرب اور ہمہ تن اور ہمہ وقت خود کو وقف رکھنے کی ہمت رکھتے تھے، عقائد، معاملات، معاشرت، تعلیم اور سیاست یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کی اصلاح و درستی کے لیے ان کی زبان اور قلم میں کبھی سستی یا کوتاہی نظر آئی اور کمال یہ ہے کہ باہمہ نظر آنے کے باوجود اصلاً وہ بے ہمہ تھے۔ قریب بانوے سال کی عمر مستعار میں اگر بچپن اور تحصیل علم کی مدت نکال لی جائے تو گویا ستر سال تک وہ ملت اسلامیہ کو اپنی نوا سنجیوں سے پرشور کرتے رہے، حق تھا کہ ایسی ہمہ جہت اور سیماب صفت ہستی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کو نظر میں رکھ کر ایک مکمل مرقع تیار کیا جاتا اور ظاہر ہے یہ حق سب سے بڑھ کر اس کا تھا جو خود سر لابیہ کا مصداق ہو۔ زیر نظر کتاب میں اسی حق کا حق ادا کیا گیا ہے، تین چوتھائی کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کو حصہ اول کہا گیا ہے، مزید ڈیڑھ سو صفحات مولانا مرحوم کے ان بندگان حق سے ربط و تعلق کے لیے خاص ہیں جن سے اخذ و یافت کا خاص معاملہ رہا، اس کو حصہ دوم بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ پندرہواں باب بھی ہوسکتا تھا۔ کتاب ان تمام خوبیوں سے آراستہ ہے جو ایک مکمل سوانح کے لیے ضروری ہیں، وطن، خاندان، پیدائش، تعلیم، درس و تدریس، مناظرے، مجاہدے، جماعت اسلامی، تحریک تبلیغ، دیوبند، ندوہ، مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لا بورڈ، انقلاب ایران، الفرقان، ندائے ملت، تصنیفات، اسفار، ملفوظات، مکتوبات، خطابات، عادات و معمولات، ازواج واولاد، وفات، ملت کے تاثرات اور قریب ترین وعزیز ترین شخصیات غرض ایک مکمل سوانح ہے جو فرد واحد ہی نہیں ایک عہد کی

تاریخ بھی بن گئی ہے، ہمہ گیر شخصیتوں کے سوانح میں فکروعمل کے مختلف بلکہ کبھی کبھی متضاد مناظر کا ہونا عین قرین فطرت ہے اسی لیے اس کی تصویرکشی بھی بڑی احتیاط ومہارت کی متقاضی ہے۔ فاضل سوانح نگار کی پختگی قلم مسلم ہے اور اس کا اظہار اس کتاب کی سطر سطر سے ہے، رد بدعات، مولانا مودودی سے تعلق اور پھر رجوع، دیوبند کا قضیہ نامرضیہ، یہ ایسے عنوانات ہیں جن میں قلم کی لغزشوں کا ارتعاش عین ممکن تھا مگر سوانح نگار یہاں جس احتیاط سے گزرے ہیں اس سے تقوی کی معنویت دوچند ہوجاتی ہے، آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ پانے کا ہنر اتنی آسانی سے آتا بھی نہیں، کہانیاں یاد دلانے کے لیے تفصیل کی کیا ضرورت، اگر حوالے اور اشارے ہی مقصود کے اظہار کے لیے کافی ہوں۔

تصوف اور بھکتی (تنقیدی اور تقابلی مطالعہ): از جناب شمیم طارق، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۷۶، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، علی گڑھ، ممبئی اور راعی بک ڈپو، ۳۴۷، اولڈ کٹرا، الہ آباد، یوپی۔

تصوف کے متعلق عام اور رائج خیال یہی ہے کہ یہ انسان کے قلب کی واردات وکیفیات کا بیان ہے، دل کی یہ ایسی کتاب ہے جس کی شرحیں اور تفسیریں ہمیشہ کی جاتی رہیں، اس ہمیشہ میں اسلام اور اس سے پہلے اور اس کے مابعد کے زمانوں کا عموم ہے لیکن مابعد اسلام اس کا خصوص بھی ہے۔ زیر نظر کتاب اگرچہ کسی سکہ بند صوفی کے مطالعہ کا نتیجہ تو نہیں لیکن مصنف کے صاحب دل ہونے میں کسی شک کی وجہ بھی نہیں، اسی لیے جب وہ تصوف کی ابتداء، ارتقاء اور رد وقبول کی بحث میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں تصوف کے اصل ماخذ اور ابتدا پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور اپنی نظر وفکر کو وسعت دے کر انسانی جبلت میں ورائے شعور، سریت، نروان اور بھکتی جیسے الفاظ وتعبیرات میں تنوع اور تضاد کی نشان دہی کی کوشش کرتے ہیں تو یہ محض سعی لاحاصل نہیں کہی جاسکتی، معروضی مطالعات میں کچھ مقامات ناہموار نظر آتے ہیں تو نظر اس پر ضروری ہے کہ تاریخ کے حوالہ سے بعض لوگوں کے افکار کی حقیقت کیا ہے؟ فاضل مصنف کی نظر سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہی، اسی لیے تزکیہ، تعلیم وتربیت کی نبوی تشریح میں وہ حقیقت کی راہ سے ذرا بھی نہیں بھٹکے، بلکہ انہوں نے صوفیائے کرام کی تمام مشہور کتابوں جیسے غنیۃ الطالبین، مکاشفۃ القلوب، کشف المحجوب وغیرہ کے متعلق صاف اقرار کیا کہ ان میں وہی تعلیمات ہیں جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں، کہیں اختلاف نظر بھی آتا ہے تو اس کی حیثیت

محدثین وفقہاء کے اختلاف کی سی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جن علماء کو تصوف کا ناقد یا غیر حمایتی تصور کیا جاتا ہے ان کے بارے میں مصنف کا قول ہے کہ یہ گمان کرنا صحیح نہیں کہ صحیح وغلط میں فرق کیے بغیر وہ کل سرمایہ تصوف کو رد کرنے کے قائل ہیں۔یہ سچائی بھی ان کے قلم کی زبان پر آگئی ہے کہ بعض صوفیہ کے شاہان وقت سے اچھے مراسم تھے اور کچھ تو ظالم بادشاہوں اور غاصب جاگیرداروں کے لیے دعائے خیر کیا کرتے تھے مگر بقول مصنف اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ہر عہد میں ظالموں اور غاصبوں کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کی صف قیادت میں صوفیہ ہی نظر آتے ہیں۔کتاب میں تزکیہ واحسان، روحانی ارتقاء اور عرفان ذات وکائنات کا باب بھی ہے، یہ دلچسپ بحث ہے جس میں تصوف کے متعلق خیالات میں ایک کروٹ لیے جانے کا اس وقت مشاہدہ ہوتا ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ ''یہ صحیح ہے کہ غیر مسلم صوفیہ میں تقریباً سبھی نے اور مسلم صوفیہ میں چند نے توحید بمعنی جمع واتحاد کو سلوک کی آخری منزل قرار دیا ہے جبکہ بعض دوسرے اہم مسلم صوفیہ نے اس کو سلوک کی درمیانی منزلوں میں سے ایک قرار دیا ہے''۔یہاں ''غیر مسلم صوفیہ'' کے الفاظ سے ذہنی تموج محسوس کیا جانا فطری ہے جو اس جملہ سے سامنے بھی آجاتا ہے کہ ''تصوف کی بعض غلط تاویلات ضرور پیش کی گئیں اور بعض صوفیہ بھی دائرۂ شریعت وسنت سے باہر نکل گئے''۔گو اس کے بعد 'مگر' سے کچھ مداوا ضرور کیا گیا ہے لیکن یہ اصلاً مقدمہ ہے بھکتی کے اس تعارف کا جو رجحان، فلسفہ، تحریک اور شاعرانہ اظہار کے عنوان سے ایک بحث میں پھیل گیا ہے، بھکتی کا مطلب طاعت وبندگی اور نہایت عقیدت ومحبت تو معلوم ہے لیکن بھگوت گیتا اور شریمد بھاگوت کی تعبیر کیا ہے، اس سے عموماً واقفیت کم ہے، کرم، گیان، ریاضت کی تشریح ممکن ہے، دل کو اچھی لگے لیکن مصنف نے بروقت یہ بھی آگاہ کر دیا کہ بھکتی تو لغوی معنی میں ہوسکتی ہے لیکن بھکتی تحریک کی اصطلاح ویشنومت کے لیے مخصوص ہے۔آگے ایک قول بغیر کسی تبصرہ کے یہ بھی نقل کیا گیا کہ ہندو بھکتوں اور مسلم صوفیہ نے یہ احساس دلایا کہ اسلام اور ہندومت کے دھارے ظاہری سطح پر اگرچہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے مگر سطح کے نیچے کوئی ہم آہنگی ضرور ہے۔اس کے لیے مثالیں بھی دی گئی ہیں، آگے کسی غلط فہمی سے بچنے کے لیے ایک اور باب ''عقیدہ میں آمیزش اور نئے فرقوں کا ظہور'' کے عنوان سے ہے اور شروع ہی میں صاف کر دیا گیا کہ تصوف، سریت اور بھکتی اپنے مفہوم، تاریخی پس منظر اور جغرافیائی ماحول کی روشنی میں ہم معنی الفاظ نہیں، اس دلچسپ اور نہایت علمی بحث کا انجام

یوں بجیر ہوا کہ تصوف اور بھکتی میں کچھ مشابہتیں ممکن ہیں مگر اعتقاد میں اتحاد و اتفاق کی راہیں ناپید ہیں، ایک باب سریت کے عنوان سے ہے کہ یہ ذائقہ مذہب وتصوف میں کس طرح سرایت کر گیا، سرایت ہی نہیں کیا اس نے بڑے فتنے بھی جگائے، کتاب میں اور بھی مباحث ہیں جیسے عقیدہ توحید اور ویدانتی وحدانیت، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود وغیرہ، کتاب کا مقصد تصوف اور دوسرے مذاہب کی روحانی تعلیمات کا موازنہ کرنا یا تقابلی مطالعہ پیش کرنا ہے، توازن واعتدال اور حقائق کو بے کم وکاست بیان کرنے کے لحاظ سے یہ واقعی کامیاب ہے، جناب محسن عثمانی کے اس جملہ کی داد میں ہر قاری شامل ہوسکتا ہے کہ ''شمیم طارق صاحب کی یہ کتاب شمیم گل کی طرح دور دور تک پہنچے گی''۔

مولانا عبدالسلام ندوی۔ایک مطالعہ: از پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۶، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، ۸- پہلا منزلہ، ہندوستان بلڈنگ ۲/۱۰ ٹی پی اسٹریٹ، ممبئی ۴۰۰۰۰۴۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم کے اس قول سے عام واقفیت ہے کہ وہ مولانا عبدالسلام ندوی سے سب سے زیادہ متاثر تھے، ہمارے نزدیک وہ متاثر ہی نہیں مولانا کے سب سے بڑے عقیدت مند تھے، اس عقیدت مندی کا اظہار جائسی صاحب کی تعلیمی زندگی سے شروع ہوا تو یہ آخری سانس تک جاری رہا، مضامین لکھنے ہوں، لکھوانے ہو، خاص نمبر کی تیاری ہو یا سمینار کا اہتمام، وہ مولانا ندوی کی یاد کو مسلسل زندگی دیتے رہے۔ساہتیہ اکیڈمی نے جب ''ہندوستانی ادب کے معمار'' کے سلسلہ میں مولانا ندوی پر کتاب چھاپنا چاہی تو اس کے لیے نظر انتخاب پروفیسر جائسی ہی پر پڑی، زیر نظر کتاب دراصل اسی ساہتیہ اکیڈمی کی کتاب کی توسیع ہے، توسیع ان معنوں میں کہ اس میں اشعار، مکاتیب اور بطور ضمیمہ مولانا ندوی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر کا اضافہ ہے۔اس طرح یہ کتاب زیادہ مفید اور جامع ہوگئی، پروفیسر جائسی کی بھانجی پروفیسر نگار سجاد ظہیر نے اس کو پاکستان سے شائع کیا، وہ جس طرح پاکستان میں دارالمصنّفین اور اس کے نقش ونگار کی آرائش میں مصروف ہیں، ہندوستان میں مولانا ندوی کے عزیز قریب جناب محمد ہارون بھی اسی طرح مولانا ندوی کے کام اور پیام کو عام کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ انہوں نے اس قابل قدر کتاب کی اشاعت کا ہندوستان میں اہتمام کیا۔یقین ہے کہ اس کتاب کو قبول عام حاصل ہوگا۔

ع ـ ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-**العلوم الدینیه والفکریه بالهند فی العهد الانکلیزی** : ڈاکٹر محمد حسان خاں، القسم العربی بجامعہ برکۃ اللہ، بھوپال۔ قیمت:۲۰۰روپے

۲-**امتناع، تنقیدی مضامین اور تبصرے**: محمد یوسف رحیم بیدری، ۱۴۸-۲-۵، دوسری منزل، گولہ خانہ، پتال نگری، بیدر (کرناٹک)۔ قیمت:۱۲۰روپے

۳-**بارش (شعری مجموعہ)**: میر بیدری، یاران ادب ۱۴۸-۲-۵، دوسری منزل، گولہ خانہ، پتال نگری، بیدر (کرناٹک)۔ قیمت:۱۵۰روپے

۴-**باقہ** : ترتیب وتہذیب: محمد یوسف رحیم بیدری، شاہین ٹیلنٹ اسکول، پی یو کالج آئی آئی ٹی اکیڈمی، احمد باغ، گولہ خانہ،، بیدر (کرناٹک)۔ قیمت:۱۰۰روپے

۵-**تحفۃ الایضاح شرح مقدمہ ابن صلاح**: مفتی نسیم احمد اعظمی، مکتبہ شیخ الاسلام، کوسہ ممبرا، ضلع تھانہ۔ قیمت: درج نہیں

۶-**تعارف**: محمد یوسف رحیم بیدری، محمد علیم الدین فاؤنڈیشن، ثنا کامپلکس، جبار کالونی، ٹسکر روڈ، بیدر۔ قیمت:۱۲۰روپے

۷-**ثقافۃ الہند (جلد اول)**: پروفیسر محمد حسان خاں، مکتبہ دین ودانش، ۱۳/ شارع مسجد شکور خاں، بھوپال۔ قیمت:۲۰۰روپے

۸-**ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی بحیثیت شبلی شناس**: شائستہ ریاض، ادبی دائرہ عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔ قیمت:۲۰۰روپے

۹-**رجوع الی القرآن - اہمیت اور تقاضے (مقالات کے سمینار)**: اشہد رفیق ندوی، ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ۔ قیمت:۳۰۰روپے

۱۰-**مجلّہ سراج الاسلام (سہ ماہی، خصوصی اشاعت بیاد حضرت مولانا زین العابدین معروفیؒ)**: مدرسہ سراج العلوم، سراج نگر، چھپرہ، ضلع مئو۔ قیمت:۶۰روپے